Regd. L. No.7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1978

اس پرچہ میں

حرام کی کمائی

(جس کے اب پھاٹک کھل گئے ہیں)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ: 2 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ	۸۸۰۰۸۰	۲
پاکستان ۲۴/- روپے	خط و کتابت	دو روپے
غیر ممالک ۳ پونڈ	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور	
جلد ۳۱	نومبر ۱۹۷۸ء	شمارہ ۱۱

فہرست

۱۔ لمعات ۲

۲۔ حرام کی کمائی (جس کے اب پھاٹک کھل گئے ہیں) ۹

محترم پرویز صاحب

۳۔ قوم اور اُمت ۲۵

۴۔ تقدیر شکن قوت اس میں ہے ابھی باقی" ۳۳

..... (قرآن کی تعلیم ابدیت و زکنار ہے) .....

محترم پرویز صاحب

۵۔ حج کا مقصد ..... محترم پرویز صاحب ۶۱

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق بمقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نثار احمد مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

اُس دس سال کے عرصہ کو چھوڑ کر جس میں تحریکِ پاکستان زیرِ قیادت، قائدِ اعظمؒ سرگرمِ عمل رہی مسلمانانِ ہند و پاکستان کی قریب ساٹھ ستر سالہ تاریخ ہنگامہ خیزیوں اور ولولہ انگیزیوں پر مشتمل رہی۔ جذبات کی ان تلاطم انگیزیوں میں طلوعِ اسلام نے ایک منفرد روش خود بھی اختیار کی اور اس کی مسلسل تلقین بھی کرتا رہا۔ اور آجتک کئے جا رہا ہے۔ ہنگامہ خیزیوں کی بنیادی وجہ مختلف مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کا وجود ہوتا ہے۔ فرقے ہوں یا پارٹیاں، ان کا جداگانہ تشخص، دوسرے فرقوں یا پارٹیوں کے خلاف جذباتِ نفرت کی بنا پر قائم رہتا ہے۔ اور باہمی نفرت کا فطری نتیجہ تزاحم اور تصادم ہوتا ہے۔ طلوعِ اسلام نے قرآنِ کریم کی تعلیم کی روشنی میں ایک فکری تحریک کی بنیاد رکھی اور ۱۹۳۸ء سے آجتک اس تحریک کو برابر آگے بڑھائے چلا آ رہا ہے۔ اس تحریک کی رو سے اس نے :۔

(۱) نہ اپنے آپ کو کسی مذہبی فرقہ سے وابستہ کیا اور نہ ہی کوئی اپنا جداگانہ فرقہ بنایا۔

(۲) نہ ہی کسی سیاسی پارٹی سے متمسک ہوا، اور نہ ہی کوئی اپنی پارٹی بنائی۔

(۳) نہ ہی عملی سیاست میں حصہ لیا۔

اس کی روش یہ رہی کہ جو معاملات سامنے آئے (اُن کا تعلق، عام الفاظ میں، دنیاوی امور سے ہو یا دینی معاملات سے) قرآنِ کریم کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا اور اس طرح جس نتیجہ پر پہنچا اسے قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ ایک جذباتی قوم میں اس قسم کی یکسر غیر جذباتی، فکری تحریک، بالکل اجنبی بھی تھی اور تھکا دینے والی بھی ——— فکر و تدبر کا عمل بظاہر جس قدر پُرسکون اور غیر متحرک نظر آتا ہے اتنا ہی زیادہ مشقت طلب اور صبر آزما ہوتا ہے۔ اور پھر جس تحریک میں کوئی مادی مفاد پیشِ نظر نہ ہوں۔ حتیٰ کہ اس میں نہ ستائش کی تمنا ہو نہ صلہ کی امید۔ اس کے ساتھ ایک لمبے عرصہ تک کے لئے وابستگی بڑی ہمت اور حوصلہ چاہتی ہے۔ اور جب اس کے ساتھ، دوسروں کی طرف سے مخالفت کے طوفان در طوفان بھی اٹھ رہے ہوں، تو یہ مرحلہ اور بھی آزمائش طلب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس دوران میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ گرم رو نوجوان اس تحریک میں شامل ہوئے۔ کچھ وقت تک اس کی پُرسکون روانیوں کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ پھر اس سے اکتا کر "عملی سرگرمیوں" کے مطالبات شروع کر دیئے اور جب انہیں سمجھایا گیا کہ اس تحریک میں سطحی جذبات کی اس انداز کی تسکین کا سامان نہیں ملے گا۔ تو وہ مایوس یا سرکش ہو کر الگ ہو گئے۔

اکثر احباب یہ بھی کہتے رہے کہ ایک جذباتی قوم میں اس قسم کی فکری تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن، طلوعِ اسلام کے سامنے خدا کا یہ ابدی اور غیر متبدل قانون تھا کہ جب تک کسی قوم میں نفسیاتی تغیر نہ ہو، اس کے خارجی احوال میں تغیر ناممکن ہے۔ اس لئے وہ اپنی اس روش پر مسلسل گامزن رہا۔ اس استقامت کا نتیجہ تھا کہ اس کی پیش کردہ فکر مسلسل آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس سلسلہ میں ایک اور تجربہ بھی ہوا۔ معتدل حالات میں تو اس تحریک کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہوتی تھی۔ لیکن جب ملک میں کسی تحریک کے برپا کردہ ہنگامے جھکڑ کی طرح اٹھتے لیکن اس کے بعد آندھیوں کی طرح بیٹھ جاتے اور وہ تحریک اپنے پیچھے تخریبات کے کھنڈر چھوڑ کر منہ چھپا کر بیٹھ جاتی تو اس کے بعد، سنجیدہ طبقہ اس اعتراف پر مجبور ہو جاتا کہ مسلک وہی صحیح ہے جسے طلوعِ اسلام پیش کر رہا ہے۔ اس سے اس تحریک کی روانی میں مزید تحرک پیدا ہو جاتا۔ یہ تحریک کس قدر ملک گیر ہو چکی ہے بادی النظر میں اس کا اندازہ اس لئے نہیں لگ سکتا کہ اس نے فرقے یا پارٹی کی شکل اختیار نہیں کی۔ لیکن اس حقیقت کی شہادت تو اس کے مخالفین بھی دیں گے کہ ملک میں جس قدر ہنگامے بھی برپا ہوئے، طلوعِ اسلام کی فکر سے متفقین نے ان میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ وہ ان جھکڑوں میں اپنا دامن سمیٹ کر آئین و ضوابط کے گوشوں میں سکونت پذیر رہے۔ مخالفین نے انہیں اشتعال دلانے کی بھی کوششیں کیں لیکن یہ ان کے فریب میں نہیں آئے۔ یہ اپنی پُرامن روش پر بدستور قائم رہے ـــــ عین قعرِ دریا میں پُرامن ترنہ ہونے دینا، کارِ ہر دیوانہ نیست۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ تحریک ان تجارب سے کامیاب ہو کر نکلی ہے، اور اب جبکہ قریب قریب تمام ہنگامہ خیز تحریکیں ناکام ثابت ہو چکی ہیں، اور "اسلام۔ اسلام" پکارنے والوں کے دعاوی کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ رہی ہے، قرآنی فکر کے لئے میدان اور بھی وسیع ہو گیا ہے۔ بایں ہمہ ہمیں اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ فکر بھی اسی صورت میں نتیجہ خیز ہو سکے گی جب اس مملکت کی سرحدیں مستحکم رہیں۔ تحریکِ پاکستان کی مخالف قوتیں، ان سرحدوں کو کمزور اور آخر الامر (پناہ بخدا) معدوم کرنے کے لئے مسلسل معروفِ جدوجہد ہیں، اور اب ان کی یہ مذموم کوششیں تیز تر ہوتی جا رہی ہیں۔ قوم میں اختلاف اور انتشار ان کوششوں کو ہوا دینے میں بڑا کام کرتا ہے۔ چونکہ ہماری قوم شدید قسم کی مذہبی واقع ہوئی ہے (یعنی اس قسم کی مذہبی جس میں عقل و فکر سے کام نہیں لیا جاتا۔ محض جذبات کا اتباع کیا جاتا ہے)۔ اس لئے اس میں مذہب کے نام پر انتشار پیدا کرنا بڑا آسان ہوتا ہے۔ آجکل شرعی قوانین سازی کے سلسلہ میں جو سرگرمیاں دکھائی جا رہی ہیں ان سے ہمارا دل دھڑکتا ہے کہ یہ اختلافات (خدانخواستہ) کہیں جنون کی شکل نہ اختیار کر لیں۔ اس سلسلہ میں حقیقت وہی ہے جس کا اعتراف اور اعلان مودودی صاحب نے آٹھ برس پہلے ان الفاظ میں کیا تھا کہ:-

> کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاء کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔
>
> (ایشیا - ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

ان کے اسی اہم اعلان کا اعادہ، اب ان کے مجلہ ترجمان القرآن میں مزید وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ہوا یوں کہ محترم جنرل ضیاء الحق صاحب نے (غالباً جون ۱۹۷۸ء میں) اپنی ایک تقریر میں اسلامی نظام کے سلسلہ میں اپنے مؤقف کی وضاحت کی۔ اس پر ترجمان القرآن کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۷۸ء میں تفصیلی تبصرہ اور تنقید شائع ہوئی۔ ہم اس تنقید کے دیگر گوشوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اس حصہ کو لیتے ہیں، جس کا تعلق موضوع زیرِ نظر سے ہے۔ جنرل موصوف نے فرمایا تھا :-

> ایسے قوانین مرتب کرنے ہیں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے لئے قابلِ قبول ہوں۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ترجمان القرآن نے کہا :-

> یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن پر اسلامی قانون کے اجراء کے داعیان اور اس سلسلہ میں کام کرنے والے محققین اور سیاسی جماعتوں اور مختلف فرقوں کے علماء نے برسوں سوچ بچار کی ہے۔ اب تک جو سوال اٹھے اور بحثیں ہوئیں اور پھر ان سے جو نتائج نکلے ان کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہ شرط پوری ہونا شاید ہی دائرۂ امکان میں ہو کہ قانون صرف وہ جاری ہو جن پر حنفی اور اہلِ حدیث ہی نہیں، شیعہ برادران بھی متفق ہوں۔ چند مسائل کو تجربہ کے طور پر ان سارے مدارسِ فکر کے اکابر کے سامنے استفتاء کے طور پر رکھیئے اور دیکھئے کہ جوابوں میں کتنے بڑے فاصلے ہیں۔
>
> (ترجمان القرآن - بابت جولائی ۱۹۷۸ء - ص ۸)

بات واضح ہے یعنی وہی جو مودودی صاحب نے آٹھ سال پہلے کہی تھی کہ قرآن و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو مختلف فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔ لیکن ستمبر ۱۹۷۸ء میں جماعتِ اسلامی کی مرکزی شوریٰ کا جو اجلاس ہوا اس میں ایک ریزولیشن یہ بھی پاس کیا گیا :-

> جماعتِ اسلامی پاکستان کی مجلسِ شوریٰ کا یہ اجلاس حکومت کو یاد دلاتا ہے کہ گذشتہ سال پوری قوم نے بے مثال جانی اور مالی قربانیاں صرف نظامِ مصطفےٰ کے قیام کے لئے دی تھیں اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے فوری طور پر عملی اقدامات کئے جائیں۔ تمام غیر اسلامی قوانین سے قوم کو نجات دلائی جائے اور ان کے بجائے <u>قرآن و سنت</u> کے مطابق قوانین کو رائج کیا جائے۔
>
> (ایشیا - ۱۷ ستمبر ۱۹۷۸ء - ص ۱۴)

یعنی ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ قرآن و سنت کے مطابق کوئی ضابطۂ قوانین ایسا مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں، اور دوسری طرف حکومت پر زور دیا جا رہا ہے کہ قرآن و سنت کے مطابق قوانین نافذ کر دیئے جائیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

سنہ ۱۹۷۰ء میں مذکورہ بالا اعلان کے بعد مودودی صاحب نے کہا تھا کہ ان حالات میں ملک میں

فقہ حنفی نافذ کر دی جائے کیونکہ ملک میں اکثریت اہل احناف کی ہے۔ ان کی اس تجویز کی، مختلف (غیر حنفی) فرقوں، بالخصوص شیعہ اور اہل حدیث حضرات کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی تھی۔ اس زمانے میں قانون سازی کا مسئلہ سرد خانے میں جا پڑا اور ان فرقوں کی مخالفت نظری بحث سے آگے نہ بڑھی۔

اب ترجمان القرآن نے مودودی صاحب کی اسی تجویز کو پھر دہرایا ہے۔ اس میں شائع شدہ (مذکورہ بالا) تبصرہ سے ملحق کہا گیا ہے:۔

> ۱۹۵۱ء میں تمام مدارس فکر کے جید اکابر اور معتمد علیہ اور وسیع النظر علماء جمع ہوئے تھے تو انہوں نے اس بات پر سمجھوتہ کر لیا تھا کہ عام ملکی قوانین مسلم اکثریت کی فقہی تعبیرات کے مطابق بنیں گے، البتہ پرسنل لا کی حد تک کوئی بھی گروہ چاہے تو اپنی فقہ کے مطابق فیصلہ لے سکتا ہے۔ (ترجمان القرآن - جولائی ۱۹۷۸ء)

یہی بات مودودی صاحب نے ۱۹۷۰ء میں کہی تھی تو مختلف فرقوں نے کہا تھا کہ:۔

(۱) یہ کہنا غلط ہے کہ ۱۹۵۱ء میں علماء نے اس پر اتفاق کر لیا تھا کہ ملکی قوانین مسلم اکثریت کی فقہی تعبیرات (یعنی فقہ حنفی کے مطابق) بنیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۵۱ء میں پاس شدہ ریزولیشن شائع کر دیا تھا۔ اس میں واقعی کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ اور

(۲) اہل حدیث اور شیعہ حضرات کی طرف سے اس تجویز کی سخت مخالفت ہوئی تھی کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔ (طلوع اسلام نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا تھا)۔

ان میں، اس باب میں اختلاف کس قدر شدید ہے اس کی ایک مثال اسی وقت ہمارے سامنے آ رہی ہے۔ ترجمان القرآن میں گذشتہ کئی ماہ سے "تعزیرات اسلام" کے عنوان سے، قاضی بشیر احمد صاحب کے قلم سے ایک مبسوط مقالہ بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔ اس میں فقہ حنفی کا مسلک پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل، جماعت اہل حدیث کے ترجمان، محدث (لاہور) میں، مولانا برق التوحیدی کے قلم سے بھی سلسلہ وار مقالہ شائع ہو رہا ہے۔ اس میں ترجمان القرآن میں شائع ہونے والی ہر قسط کی مخالفت ہوتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ فقہ حنفی کا مؤقف کس طرح خلاف اسلام ہے۔ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "فقہ علی العموم اس قابل نہیں کہ اسے آج کے معاشرہ میں من وعن نافذ کر دیا جائے۔ لیکن فقہ حنفی کی شان نرالی ہے کہ جس کی بنیاد (۷۵) فی صد حیلہ سازی پر ہے۔ (محدث بابت شعبان، رمضان ۱۳۹۸ھ - صـ ۲۵)۔

ابھی یہ بحث محض نظری ہے کیونکہ یہ فقہ ملک میں نافذ نہیں ہوئی۔ اگر یہ قانون کی حیثیت سے نافذ ہو گئی تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا، آپ خود سوچ لیجئے۔ مذہبی قوانین کا معاملہ عام ملکی قوانین سے مختلف ہوتا ہے۔ شرعی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں یہ مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے کہ انہیں فی الفور نافذ کر دیا جائے۔ اس مطالبہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اگلے دنوں (جماعت اسلامی کے نمائندہ) وفاقی وزیر، محترم محمود اعظم فاروقی نے (پشاور میں) فرمایا تھا:۔

یہ مطالبہ بھی کیا جاتا ہے کہ اسلامی سسٹم چوبیس گھنٹے کے اندر اندر نافذ کیا جائے۔ میں ایسا مطالبہ کرنے والے سیاسی لیڈروں سے کہوں گا کہ وہ "اپنا نسخہ" حکومت کے سامنے پیش کریں تاکہ اسلامک سسٹم جلد از جلد نافذ کر دیا جائے۔

(پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۵ر اکتوبر ۱۹۷۸ء)

ہم محترم فاروقی صاحب کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ایسا، خود ان کی جماعت کے بانی، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے فرمایا تھا۔ انہوں نے مئی ۱۹۷۶ء میں وکلاء کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:۔

میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں، دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس روز ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔

(ایشیا۔ ۹ر مئی ۱۹۷۶ء)

بہرحال، جہاں تک طلوعِ اسلام کا تعلق ہے وہ اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ اس نے گذشتہ تیس سال میں اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ اگر کوئی اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہے تو اسے اپنے ہر سوال کا جواب اس میں مل جائے گا۔ ہم انتظار کریں گے کہ ملک میں "شرعی قوانین" نافذ ہو جائیں۔ چونکہ آئین کی رو سے ان قوانین کا کتاب و سنت کے مطابق ہونا ضروری ہوگا، ہم ان کا جائزہ لیں گے، اور جو قانون کتاب اللہ کے خلاف ہوا اس کی نشان دہی کریں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو قانون قرآن کے خلاف ہوگا وہ لامحالہ سنت کے بھی خلاف ہوگا۔ کیونکہ حضورؐ کا کوئی قول یا فعل قرآن مجید کے خلاف ہو نہیں سکتا تھا۔

(۰)

طلوعِ اسلام کی تحریک میں اس کی سالانہ کنونشنوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان سے اس کی پیش کردہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں تحرک بھی پیدا ہو جاتا ہے اور وسعت بھی۔ لیکن یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب ملک کی فضا پُرسکون ہو۔ سالِ گذشتہ ملک کا ماحول سازگار نہیں تھا تو ہم نے کنونشن کا انعقاد (جو عام طور پر اکتوبر۔ نومبر میں ہوتا ہے) ملتوی کر دیا تھا۔ امسال بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ ذہنوں میں وہ یکسوئی اور دلوں میں وہ سکون نہیں جو فکری انگیزی کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ اس لئے فیصلہ یہی کیا گیا ہے کہ فضا کے مساعد ہونے تک کنونشن کا انعقاد ملتوی کر دیا جائے۔ اس کا ہمیں افسوس ضرور ہے لیکن ایسا فیصلہ ناگزیر ہے۔ کنونشن سے مقصود نہ نمائش ہوتی ہے نہ شہرت۔ اس کا مقصد قرآنی تعلیم کا زیادہ سے زیادہ قلوب و اذہان تک پہنچانا

ہوتا ہے۔ اور جب اس مقصد کے حصول کے لئے فضا سازگار نہ ہو تو کنونشن کا انعقاد سعی لاحاصل ہے۔ کنونشنوں کے عدمِ انعقاد کی کمی، کچھ حد تک مختلف قرآنی موضوعات پر پمفلٹوں کی عام تقسیم کے ذریعے پوری کی گئی ہے۔ ان کا بڑا خوشگوار اثر ہوا ہے۔

پرویز صاحب نے طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۸ء میں ـــــ اپنی عمر رفتہ کو آواز دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کی طبعی عمر (۷۵) سال ہو گئی ہے، اور اس میں قریب پچاس سال کی مدت قرآن کریم پر غور و فکر اور اس کے ماحصل کی نشر و اشاعت کے لئے وقف رہی ہے۔ پرویز صاحب نے اپنی سالگرہ منانے کی تجویز کو تو کبھی پسند نہیں کیا لیکن ان کی پیش کردہ قرآنی فکر سے مستفید ہونے والے احباب نے فیصلہ کیا ہے کہ قرآنی فکر کی یہ پچاس سالہ (گولڈن جوبلی کی) تقریب ضرور منائی جائے۔ پہلے ارادہ تھا کہ اس تقریب کو طلوعِ اسلام کنونشن کے ساتھ ملحق کر لیا جائے لیکن کنونشن کے ملتوی ہو جانے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس تقریب کو طلوعِ اسلام کی بزموں تک محدود رکھا جائے، البتہ ایک درس میں دیگر حضرات کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے۔ بنا بریں ۱۶ نومبر ۱۹۷۸ء (جمعۃ المبارک) کا درس عام ہوگا۔ یہ درس حسبِ معمول ادارہ طلوعِ اسلام کے سبزہ زار پر (۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ کی چار دیواری کے اندر) منعقد ہوگا۔ البتہ اس کا وقت، معمول کے درسوں سے زیادہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں پرویز صاحب کے خصوصی درس کے علاوہ، دیگر شرکاء بھی حصہ لیں گے۔ بزموں کو ضروری اطلاع نامہ بھیج دیا گیا ہے۔ دیگر حضرات کے لئے یہ اعلان کافی ہوگا۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، قرآنی جوبلی کی تقریب ۱۶/۱۷ نومبر ۱۹۷۸ء کو منائی جا رہی ہے۔ اِس کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ دسمبر کے رسالہ کی اشاعت میں قدرے تاخیر ہو جائے۔ قارئین مطلع رہیں۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع پندرہ دسمبر کے بعد دیں۔ شکریہ!

۱۔ پرچہ کی ترسیل کے متعلق خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔
۲۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی خط بھیجیے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ) ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
149 SUTTON COURT ROAD
LONDON E13 — 9NR
PHONE 01—552—1517

لاہور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (فون - 880800)
۲۵/بی - گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب - عابد سلک انڈسٹریز
(فون 30894) (عقب اڈہ لاریاں - مائی دی جھگی)

کراچی ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام - کمرہ ۲۴ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ - نیو چالی - کراچی ۲

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
(فون 72071) دفتر شاہ سنٹر - بیرون پاک گیٹ

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان، آغا محمد یونس صاحب - رفیق لین صدر مقابل دی پی آئی
میں گیٹ پشاور سٹیڈیم باڑہ روڈ۔

گجرات میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ نیز بروز اتوار چار بجے شام
بمقام ۱/۱/۱۲ بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خاں - نواب علی روڈ۔

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
(گجرات) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۶۶ - لیاقت روڈ

لیہ میں ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب کیپٹن غلام حیدر مرحوم کے مکان ۳۵۱ (وارڈ ۱) واقع عقب گلی گرلز ہائی اسکول (بذریعہ ٹیپ)

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

کتب خانہ کے اوقاتِ کار حسبِ ذیل ہیں:

ہر روز علاوہ جمعہ: صبح ۱۰ بجے تا ایک بجے دوپہر
شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ: صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

محمد اسلام

کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام
کمرہ ۲۴ ہارون چیمبرز - الطاف حسین روڈ - نیو چالی - کراچی ۲

کتب خانہ میں

ادارہ طلوعِ اسلام کی جملہ مطبوعات دستیاب ہیں اور ایک پوسٹ کارڈ تحریر کرکے بھی منگوائی جا سکتی ہیں۔

باسمہٖ تعالیٰ

اے طائرِ لاہوتی اُس رِزق سے موت اچھی
جس رِزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!

حرام کی کمائی

پرویز

حرام کی کمائی

(جس کے آجکل پھاٹک کھل گئے ہیں)

ایک مسلمان کتنا ہی گیا گذرا کیوں نہ ہو۔ اس کے اخلاق بھی خراب ہوں۔ وہ احکامِ شریعت کی اطاعت بھی نہ کرتا ہو۔ وہ نماز روزے کا بھی پابند نہ ہو۔ وہ فاسق و فاجر ہو۔ حتیٰ کہ وہ زانی اور شرابی بھی کیوں نہ ہو۔ ایک بات ایسی ہے جس کا وہ نہایت سختی سے پابند ہوگا۔ وہ یہ کہ وہ سؤر (کے گوشت) کو حرام سمجھے گا۔ وہ اسے کبھی نہیں کھائے گا۔ط اس پر ہزار سختی کی جائے یا کتنا ہی بڑا لالچ کیوں نہ دیا جائے، وہ اس کے قریب تک نہ جائے گا۔ سؤر کے گوشت کا کھانا تو ایک طرف، وہ اس کا نام تک سننا گوارا نہیں کرے گا۔ اس کے تصوّر سے اُسے جھرجھری آجائے گی۔ اگر اسے کہا جائے کہ تم نے فلاں بدمعاملگی کی ہے تو وہ (اپنی صفائی میں) بلا ساختہ کہے گا کہ میرے لئے تو ایک پیسہ بھی سؤر کے برابر ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس طرح سؤر کے متعلق ہمارا ردِّ عمل یہ ہے، کیا ناجائز کمائی کے متعلق بھی ہمارا ردِّ عمل اس قسم کا ہے؟ بالکل نہیں۔ قطعاً نہیں۔ حالانکہ جس خدا نے سؤر کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے اسی نے ناجائز کمائی کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ تو کیا یہ امر موجبِ حیرت نہیں کہ ایک حرام کے متعلق تو اس قدر شدید ردِّ عمل اور دوسرے حرام کے خلاف ردِّ عمل تو کجا، اس کے حرام ہونے کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا؟ سؤر کا گوشت تو ایک طرف رہا۔ اگر کسی ہوٹل کے متعلق شبہ ہو جائے کہ اس میں کباب، سؤر کی چربی میں تلے جاتے ہیں، تو اس ہوٹل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ لیکن وہی لوگ ساری ناجائز کمائی سے اپنا پیٹ بھرتے رہتے ہیں اور انہیں کبھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم حرام کھا رہے ہیں۔ ناجائز کمائی میں بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں حکومت کا مروّجہ قانون جرام قرار دیتا ہے۔ اس قسم کی کمائی کے متعلق یہ تو کہا جائے گا کہ ایسا کرنا جرم ہے۔ یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ ایسا کرنا "حرام" (یا گناہ) ہے ——— اور اگر معاشرہ میں جرائم عام ہو جائیں تو اس کمائی کے جرم ہونے کا احساس بھی مٹ جائے گا۔ ناجائز کمائی کی بعض صورتیں ایسی ہوں گی جنہیں مروّجہ قانونِ حکومت جرم قرار نہیں دیتا۔ اس سے اجتناب برتنے کا احساس تک نہیں ہوگا۔

ط ہمیں معلوم ہے کہ بعض ممالک کے مسلمان اس معاملہ میں ایسے متشدد نہیں رہے۔ ہمیں ان سے سروکار نہیں۔ پاکستان میں ہنوز ویسی صورت پیدا نہیں ہوئی اور ہمارے اس وقت کے مخاطب یہی اہلِ پاکستان ہیں۔

لیکن جس خدا پر ایمان لانے سے ہم مسلمان کہلاتے ہیں۔ اس نے حرام اور حلال اور جائز و ناجائز کا معیار کچھ اور بتایا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ وہ معیار کیا ہے۔

باطل کی کمائی

قرآنِ مجید کی دو اصطلاحیں بڑی بنیادی ہیں۔ یعنی حق اور باطل۔ قرآن کریم آمدنی کے جن ذرائع کو، جائز قرار دیتا ہے، وہ آمدنی حق کے مطابق اور حلال ہے۔ جن ذرائع کو وہ ناجائز ٹھہراتا ہے، وہ آمدنی باطل اور حرام ہے۔ حرام اور حلال کا یہ بنیادی معیار ہے۔

قرآن مجید سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۷-۱۸۳ میں روزوں کے احکام ہیں۔ روزہ کے معنے یہ ہیں کہ ایک مسلمان روزہ کی حالت میں خدا کے حکم کے مطابق ان چیزوں کو بھی اپنے اوپر حرام قرار دے لیتا ہے جنہیں خدا نے عام حالات میں حلال قرار دیا ہے۔ وہ خدا کے اس حکم کی اس شدت سے پابندی کرتا ہے کہ سخت سے سخت گرمی میں انتہائی پیاس کی حالت میں، کمرے کے اندر تنہا بیٹھے ہوئے جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا، پانی کا ایک قطرہ بھی حلق میں نہیں ٹپکاتا۔ لیکن روزوں کے احکام کے بالکل ملحق آیت (۲/۱۸۸) میں اسی خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ:-

وَلَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ۔ (۲/۱۸۸)

ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے نہ کھاؤ۔

"یہ روزہ" تو ایک طرف، وہ روزہ دار جو مرتا مر جائے گا لیکن پانی کا ایک گھونٹ نہیں پیئے گا، باطل کی کمائی کے متعلق خدا کے اس حکم کی کچھ پرواہ نہیں کرے گا۔ وہ روزہ کی حالت میں بھی ایسی کمائی کرنے میں مصروف رہے گا! ہمارے ہاں روزوں کے احکام کو آیت (۲/۱۸۷) تک محدود رکھا جاتا ہے۔ ان آیات میں آیت (۲/۱۸۸) کو شامل نہیں کیا جاتا۔ لیکن روزہ میں بھی تو مسلمانوں کو اس امر کی مشق کرائی جاتی ہے کہ جن چیزوں کو چھوڑنے کا خدا حکم دے، وہ انہیں بلاتامل چھوڑ دے، خواہ وہ حلال ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن ہماری یہ پابندی صرف کھانے پینے کی چیزوں تک محدود رہتی ہے۔ ناجائز کمائی کو اس میں شامل نہیں کیا جاتا۔ بالکل اسی طرح، جیسے سؤر کھانے کو تو حرام سمجھا جاتا ہے لیکن ناجائز کمائی کو حرام نہیں سمجھا جاتا۔

قرآنِ کریم بنی اسرائیل (یہودیوں) کی تباہی کا ایک بنیادی سبب یہ بتاتا ہے کہ: أَكْلِهِمْ أَمْوَٰلَ ٱلنَّاسِ بِٱلْبَٰطِلِ۔ (۴/۱۶۱) "وہ لوگوں کا مال ناجائز طریق سے کھا جاتے تھے۔" اس کے آگے ہے —— وَأَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا۔ (۴/۱۶۱) "ان میں سے جو اس جرم کے مرتکب ہوتے تھے، وہ کافر تھے اور ان کے لئے سخت عذاب کی وعید کی گئی تھی"۔ —— اس سے ظاہر ہے کہ ناجائز کمائی کرنا، کفر کے مرادف اور عذابِ جہنم کا موجب ہے۔ —— سوچیئے کہ اس ناجائز کمائی کے خلاف اس سے زیادہ واضح اور سخت تہدید اور کیا ہو سکتی ہے!

باطل (ناجائز) کمائی کے بہت سے گوشے ہیں مثلاً، دغا، فریب - رشوت - چوری - خیانت - دھاندلی ——

گراں فروشی۔ چور بازاری۔ وغیرہ، لیکن اللہ تعالٰے نے ایک ایسے گوشے کا ذکر خاص طور پر کیا ہے جس کی طرف عام طور پر ہماری نگاہ نہیں جاتی۔ اس نے کہا ہے۔

احبار و رہبان

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ (۹/۳۴)

اے جماعتِ مومنین! (یاد رکھو) علماء اور مشائخ میں سے اکثریت کی یہ حالت ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریق سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی طرف جانے والی راہ سے روکتے ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

یعنی (وہ) روپیہ لے کر احکامِ شرعیہ اور اخبارِ الٰہیہ کو بدل ڈالتے ہیں۔ ادھر عوام الناس نے انہیں، جیسے پہلے گذرا، خدائی کا مرتبہ دے رکھا ہے۔ جو کچھ غلط سلط کہہ دیں وہی ان کے نزدیک حجت ہے۔ اس طرح علماء و مشائخ نذرانے وصول کرنے، ٹکے بٹورنے، اور اپنی سیادت و ریاست قائم رکھنے کے لئے عوام کو مکر و فریب کے جال میں پھنسا کر راہِ حق سے روکتے رہتے ہیں۔ کیونکہ عوام اگر ان کے جال سے نکل جائیں اور دینِ حق اختیار کرلیں تو ساری آمدنی بند ہو جائے۔

(حاشیہ شیخ الہند، مولانا محمود الحسنؒ۔ صفحہ ۲۴۸)

(۰)

خبیث اور طیّب

جائز اور ناجائز کمائی کے سلسلہ میں، قرآن مجید میں اور اصطلاحات بھی آئی ہیں۔ مثلاً ـــــ طیب اور خبیث ـــــ حق و باطل کی طرح یہ اصطلاحات بھی بڑی جامع ہیں لیکن موضوع زیرِ نظر کی رو سے، ان کا مفہوم بھی جائز اور ناجائز لیا جانا زیادہ مناسب ہے۔ اللہ تعالٰے نے حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا ایک مقصدِ جلیلہ یہ بتایا ہے کہ:۔

وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔ (۷/۱۵۷)

وہ لوگوں کے لئے طیّبات کو حلال اور خبائث کو حرام قرار دے گا۔

قرآن کریم کے اس واضح ارشاد کے مطابق، جائز کمائی طیب یعنی حلال ہے اور ناجائز کمائی خبیث یعنی حرام۔ یعنی لفظ احرام) لحمِ خنزیر (سؤر کے گوشت) کے متعلق آیا ہے۔ (۵/۳) لہٰذا ایک مسلمان کے لئے سؤر اور ناجائز کمائی میں ذرا بھی فرق نہیں دونوں یکساں حرام ہیں۔ اسی لئے فرمایا کہ: لَا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَکَ کَثْرَۃُ الْخَبِیْثِ۔ (۵/۱۰۰) " چونکہ ناجائز طریق سے انسان چند دنوں میں لاکھوں پتی

ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہر شخص لپک کر اس کی طرف جاتا ہے۔ لیکن (مسلمانوں! تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ) جائز، اور ناجائز کمائی کبھی ایک جیسی نہیں ہو سکتی، اسی طرح جیسے حلال اور حرام ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ قرآنِ مجید نے خبیث و طیب (جائز اور ناجائز) کی کئی مثالیں دی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال یہ ہے کہ:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا۔ (۴/۲)

اور یتیموں کو ان کا مال اسباب ٹھیک ٹھیک دیا کرو۔ ایسا نہ کرو کہ ان کی طیب چیزوں کو رکھ لو اور ان کے بدلے اپنی خبیث چیزیں انہیں دیدو۔ نہ ہی ان کے مال اور اپنے مال کو ملا کر گڈھ مڈھ کر دو۔ یاد رکھو! ایسا کرنا سخت بے انصافی کی بات اور وبالِ عظیم کا باعث ہے۔

"یتیم" سے بالعموم وہ بچے مراد ہوتے ہیں جن کا باپ فوت ہو جائے۔ یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن اس کے بنیادی معنیٰ ہر وہ شخص ہے جو معاشرہ میں تنہا، بے یار و مددگار رہ جائے۔ مندرجہ بالا حکم میں اس قسم کے تمام افراد شامل ہیں۔ چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "ان احکام میں بیٹوں کے حکم کو شاید اس لئے مقدم بیان فرمایا کہ یتیم بے سروسامانی اور مجبوری اور بے بھارگی اور بے کسی کے باعث، رعایت اور حفاظت اور شفقت کا نہایت محتاج ہے۔" (ایضاً ص ۹۹) اس سے واضح ہے کہ جو لوگ معاشرہ میں بے سروسامان۔ کمزور۔ مجبور۔ بے چارہ اور بے کس ہوں۔ ان کی بے کسی اور بے چارگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ حاصل کرنا، خبیث (حرام) ہے۔ آگے چل کر کہا کہ اس طرح حاصل کردہ مال کے متعلق یوں سمجھو کہ وہ لوگ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہے ہیں۔ (۴/۱۰) بادنیٰ تعمق یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اکثر و بیشتر حالات میں ناجائز کمائی، دوسروں کی مجبوری، بے چارگی، بیکسی اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر حاصل کی جاتی ہے۔ ایسی کمائی قطعاً حرام ہے۔

رشوت

آجکل حرام کمائی میں رشوت کا نام سرفہرست آتا ہے۔ اس کا چلن ایسا عام ہو گیا ہے کہ آپ نے اچھے اچھے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ کیا کیا جائے آجکل رشوت کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ دونوں کے احکام کے تسلسل میں ایک آیت (۲/۱۸۸) کا ایک حصہ پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ پوری آیت یوں ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۱۸۸)

آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ۔ نہ ہی اسے بطور رشوت حکام تک

اس مقصد کے لئے پہنچاؤ کہ کسی دوسرے کے مال میں سے تمہیں وہ مل جائے جس کے متعلق تم جانتے ہو کہ تم اس کے حقدار نہیں ہو۔

کس قدر صاف اور واضح ہے یہ حکمِ خداوندی۔ آج کون نہیں جانتا کہ رشوت حرام ہے لیکن اس کے باوجود جانتے بوجھتے اس کا چلن عام ہو رہا ہے۔ حیرت ہے کہ سؤر کو حرام سمجھ کر اس سے مجتنب رہنے والے، رشوت کا مال کس طرح بلاغل و غش ہڑپ کرتے رہتے ہیں!۔

———(۰)———

کاروباری دُنیا

رشوت کا تعلق تو پھر بھی ایک مخصوص حلقہ سے ہے۔ یعنی ان لوگوں سے جنہیں دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا کچھ اختیار اور اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جس راستے سے حرام کی کمائی سیلاب کی طرح امڈ کر آتی ہے وہ کاروبار کا میدان ہے۔ "کاروبار" میں تجارت، لین دین، خرید و فروخت بھی شامل ہے اور ملیں اور فیکٹریاں بھی، جن میں محنت کشوں اور کارخانہ داروں کا باہمی تعلق ہوتا ہے۔ اس میدان میں ناجائز کمائی کے بے تحاشا امکانات کے پیشِ نظر قرآنِ مجید نے مختلف انداز سے احکامات دیئے ہیں۔ سب سے پہلے عام تجارت کو لیجئے۔ فرمایا:۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوٓا أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا۔ (۴/۲۹)

اے جماعتِ مومنین! تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ۔ معاشرتی زندگی میں روزمرہ کی اشیائے ضروریہ کی خرید و فروخت ناگزیر ہوتی ہے۔ اس کے لئے جائز طریق یہ ہے کہ خریدار دکاندار کی منہ مانگی قیمت دینے پر مجبور نہ ہو۔ بلکہ یہ گاہک اور دکاندار کی باہمی رضامندی سے ہو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو یہ دوسروں کو قتل کر دینے کے مرادف ہو گا۔ خدا تمہیں ازراہِ ترحم قتل و غارتگری سے بچانا چاہتا ہے۔

اس آیۂ جلیلہ میں خرید و فروخت کا ایک ایسا عظیم اصول بیان کیا گیا ہے جس سے سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور وہ ہے "باہمی رضامندی سے تجارت" اس سلسلہ میں جو کچھ آجکل ہو رہا ہے اس پر ایک نگاہ ڈالیئے۔ دکاندار (خواہ وہ تھوک فروش ہوں یا خوردہ فروش) ایک تنظیم قائم کر لیتے ہیں جس کی رُو سے وہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ فلاں چیز اتنے داموں میں بیچی جائے گی۔ صاحبِ ضرورت، بازار (یا منڈی) میں پہنچتا ہے۔ دوکاندار اسے مطلوبہ چیز کی قیمت بتاتا ہے۔ خریدار دیکھتا ہے کہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ وہ کچھ کم کرنے کو کہتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ "میں تو اتنے ہی میں دوں گا۔ آپ کو کہیں اور سے سستی ملتی ہے تو وہاں سے لے لیجئے"۔ خریدار مختلف دکانوں سے دریافت کرتا ہے تو اُسے وہی قیمت بتائی جاتی ہے۔ فرمایئے کہ وہ،

اس کے بعد کیا کرے؟ اسے اس چیز کی ضرورت ہے اس لئے وہ اُسے انہی داموں خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دکانداروں سے پوچھئے تو وہ نہایت دھڑلے سے کہتے ہیں کہ صاحب! ہم کسی کی جیب نہیں کاٹتے۔ چوری نہیں کرتے۔ ڈاکہ نہیں ڈالتے۔ گاہک کو قیمت بتاتے ہیں اور اسے اختیار ہوتا ہے کہ وہ اسے خریدے یا نہ خریدے۔ یہ قرآنِ مجید کے ارشاد کے عین مطابق ہے جس کی رو سے اُس نے "تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ" کو حلال قرار دیا ہے۔

اس جواب میں اس کے سوا کیا کہا جائے جو اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔ (۲/۲۶) "اسی قرآن سے اکثر لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں اور اسی سے اکثر صحیح راستہ اختیار کرتے ہیں"۔ جس قسم کی تجارت کا ذکر اوپر کیا گیا ہے (اور جسے آجکل قطعاً ناجائز یا معیوب نہیں سمجھا جاتا) اسے قرآن کے حکم کے مطابق قرار دینا، ضلالت (خود فریبی) نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر یہ دکاندار (مثلاً) سبزی فروش ہے تو اس سے پوچھئے کہ جب تم قصاب سے گوشت خریدتے ہو اور وہ ایسا نرخ بتاتا ہے کہ جسے تم نامناسب سمجھتے ہو، لیکن اس کے باوجود تم اس نرخ پر گوشت خریدنے پر مجبور ہوتے ہو، تو کیا تم اسے "باہمی رضامندی سے تجارت" قرار دیتے ہو! قصاب کی روش کو تو تم ظلم و زیادتی سمجھتے ہو اور اس کے خلاف واویلا مچاتے ہو لیکن اپنی اسی قسم کی روش کو بالکل جائز قرار دیتے ہو!

قرآنِ کریم نے اس قسم کی تجارت کو کاروبار نہیں بلکہ قتل و غارت گری قرار دیا ہے (وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ)۔ اور جیسا کہ معلوم ہے قتل، عدالتِ خداوندی میں سنگین ترین جرم ہے۔ اسی لئے اگلی آیت میں ہے:۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا۔ (۴/۳۰)

خدا نے بات واضح طور پر سمجھا دی ہے۔ اگر تم اس کے بعد بھی ایسا ہی کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دیدہ و دانستہ احکامِ خداوندی سے سرکشی برتتے اور ظلم اور زیادتی کرتے ہو۔ اس کی سزا جہنم ہے۔ عدالتِ خداوندی سے اس قسم کی سزا کا ملنا کچھ بھی مشکل نہیں۔

چونکہ اس قسم کی تجارت میں، اشیائے ضروریہ کے تیار کرنے یا پیدا کرنے والے، تھوک فروش اور خوردہ فروش سب شامل ہوتے ہیں، اس لئے تجارتِ عادلہ ایک خاص نظام کے تحت ہی عمل میں آسکتی ہے۔ یعنی ایسا انتظام جس کی رُو سے، ہر شے کا ہر اسٹیج پر منافع مقرر ہو اور اس کے بعد اس کا انتظام ہو کہ ہر ضرورت مند کو مقررہ قیمت پر مطلوبہ چیز مل جائے۔ اسے کہا جائے گا۔ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ یہی منافع حلال ہوگا۔

ربوٰ

قرآنِ کریم نے بیع کو حلال اور ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے۔ (وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۲/۲۷۵)

ربوٰ کی بحث تفصیل طلب ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ (میں اس کے متعلق تفصیل سے بہت کچھ لکھ چکا ہوں) اس وقت میں ربوٰ (سود) کی اس ابتدائی شکل کو لیتا ہوں جس میں ایک ضرورت مند، قرض دینے والے کو سود (یا بیاج) دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر، قرض خواہ جو کچھ وصول کرتا ہے، قرآن مجید اسے حرام قرار دیتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے کہ اگر تم اس روش سے باز آ جاؤ تو صرف اپنا اصل زر وصول کر سکتے ہو۔ اس سے لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹) نہ تم پر ظلم و زیادتی ہوگی کہ تمہارا اصل تمہیں مل جائے گا۔ اور نہ ہی مقروض پر کوئی زیادتی کہ اسے اپنی مجبوری کے تحت زیادہ نہیں دینا پڑے گا۔

قرآن کریم کے اس اصول کے مطابق دیکھئے کہ اس نے جو بیع کو حلال کیا ہے اور ربوٰ کو حرام، تو اس میں بنیادی نکتہ ہی یہ ہے کہ جو کچھ کسی سے اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر وصول کیا جائے وہ حرام ہے۔ اگر بیع میں بھی ایسا ہوتا ہے تو وہ بیع، بیع نہیں رہتی، ربوٰ ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے تو مروجہ معاشیات میں پوری کی پوری تجارت، ربوٰ میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور ایک تجارت پر ہی کیا موقوف ہے۔ آج زندگی کا کونسا معاملہ ہے جس میں دوسرے کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا جاتا؟

میزان

قرآن کریم نے میزان کو بڑی اہمیت دی ہے۔ بنیادی طور پر اس نے کہا ہے کہ کارگہ کائنات میزان کے سہارے چل رہا ہے۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ۔ (۵۵/۷) خدا نے ایسے قوانین وضع کر دیئے ہیں جن کی رو سے آسمانی کُرّوں میں باہمی توازن قائم رہتا ہے۔ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ۔ (۵۵/۸-۹) اس لئے تم بھی اپنے معاشرہ میں عدل و انصاف کے ساتھ توازن قائم رکھو۔ اور کسی کے حقوق و فرائض میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرو۔

انسانی معاشرہ میں عدل و انصاف قائم رکھنے کے لئے جو نظام قائم کیا جائے گا اس میں احکام خداوندی کے ساتھ میزان کو بھی منزل من اللہ بتایا گیا ہے۔ (۵۷/۲۵ ; ۴۲/۱۷)۔ اور قیامت میں اعمال انسان کے "تولنے" کے لئے بھی میزان کھڑی کی جائے گی۔ (۲۱/۴۷) اس میزان کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ: فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا (۲۱/۴۷)۔ "تاکہ کسی شخص پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہو" یہ ہے میزان کا بنیادی مقصد۔

میزان کے اس بنیادی مقصد کو سامنے رکھ کر، آپ کاروباری دنیا کی طرف آئیے۔ اس میں عام حکم تو یہ دیا گیا ہے کہ: اَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (۶/۱۵۲ ; ۱۷/۳۵)۔ خرید و فروخت کی دنیا میں تو اس حکم سے عام مراد یہی ہوگی کہ ماپ اور تول کے پیمانے صحیح رکھو۔ لیکن بنظر تعمق دیکھنے سے

یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جو کچھ کسی سے لو، یہ دیکھو کہ اُسے اس کی قیمت کے مطابق چیز ملتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ماپ اور تول صحیح رکھنا تو ہر دکاندار کا انفرادی عمل ہوگا لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ گاہک کو اس کی ادا کردہ رقم کے مطابق چیز مل رہی ہے یا نہیں، کسی نظام کے تابع ہوگا۔ یعنی اشیاء صرف کی قیمتیں مقرر کرنا اس نظام کا فریضہ ہوگا۔ اسی میں یہ بات بھی شامل ہوگی کہ خریدار کو آمیزش کے بغیر مطلوبہ چیز ملے۔ یہ نہ ہو کہ قیمت تو دودھ کی ادا کرے اور ملے اُسے "دودھیا پانی" (MILKY WATER) یا کپڑے کے ہر گز پر لکھا ہوا تو ہو (PURE WOOL) اور ہو اس میں (NYLON) کا مکسچر اس قسم کی تجارت بھی حرام ہوگی۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ جس قوم کے کاروبار میں اس قسم کی خرابیاں پیدا ہو جائیں، وہ بہت جلد تباہ ہو جاتی ہیں۔ اسی کی شہادت میں اس نے قوم شعیبؑ کی عبرت آموز داستان بیان کی ہے۔ حضرت شعیبؑ ان سے بار بار کہتے تھے کہ: فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (۷/۸۵) "تم ماپ اور تول کے پیمانے صحیح رکھو، اور جو کچھ کسی سے لو اس کے مطابق اُسے چیز دو۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہ کرو۔ ایسا کرنا ملک میں فساد برپا کرنے کے مرادف ہوگا۔ جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ (نیز ۱۱/۸۴-۸۵، ۲۶/۱۸۱) اس سے واضح ہے کہ خرید و فروخت کے غلط نظام کا نتیجہ پوری کی پوری قوم کی تباہی ہوتا ہے۔

—— (٠) ——

محنت کا معاوضہ

قرآن کریم کی رُو سے سب سے اہم سوال محنت کش کی محنت کے معاوضہ کا ہے۔ اگر اس کو محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دیا جائے تو جو کچھ اس میں سے غصب کر لیا جائے، وہ حلال نہیں ہوگا، حرام ہو جائے گا۔ اس نے صاحب ضرب کلیم حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی آویزش کے سلسلہ میں کہا ہے کہ فرعون دوسروں کی محنت کو غصب کر لیتا تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ اس کے مستبد اور ظالم نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی قائم کریں۔ لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ۔ (۲۰/۱۵) "تاکہ ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے۔" فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا (۲۰/۱۱۲) اور کسی کو اس کا خطرہ نہ رہے کہ اس کے ساتھ ظلم و زیادتی ہوگی۔ اور اس کی محنت کے معاوضہ کو ہضم کر لیا جائے گا۔

نظامِ سرمایہ داری میں یہ ناممکن ہے کہ محنت کش (مستاجر) کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا جا سکے۔ اس میں محنت کشوں کو اُجرت (WAGES) پر ملازم رکھا جاتا ہے۔ مستاجر (مزدور) اپنی اُجرت مقرر نہیں کرتا۔ اسے آجر (ملازم رکھنے والا) مقرر کرتا ہے۔ اس معاملہ کو یہ کہہ کر برحق قرار دے دیا جاتا ہے کہ مزدور اپنی رضامندی سے اُجرت منظور کرتا ہے، اس لئے اس پر کوئی ظلم اور

زیادتی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ وہی دلیل ہے جسے ہم تجارت کے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ "خریدار اپنی رضامندی سے قیمت ادا کرتا ہے"۔ واقعہ یہ ہے کہ خریدار ہو یا مزدور، دونوں اپنی مجبوری کی وجہ سے دوسرے کی بات مان لیتے ہیں۔ جس مزدور کے گھر میں کھانے کو ہو وہ کبھی آجر کی نامناسب شرائط پر کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ اس کی معاشی مجبوریاں ہوتی ہیں جو وہ ہر شرط پر کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ پنجابی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ "بھا رکھن دکار یا ۔۔۔۔ رات دیاں بھکیاں" "رات کو بھوکے سونے والے نرخ بگاڑ دیتے ہیں"۔ قرآن کے معاشی نظام میں اُجرتوں کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ مملکت تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتی ہے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب (اور جہاں) قرآنی نظام رائج ہو۔ سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں کیا کیا جائے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ مملکت ایسا طریق وضع کرے جس سے محنت کش کی محنت غصب نہ کی جا سکے۔ ہم تو آجر سے اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ مستاجر (مزدور) کی محنت سے جو کچھ غصب کیا جائے وہ رزق حلال نہیں رہتا۔

کام چور

قرآن کریم جہاں آجر کو اس کی تاکید کرتا ہے کہ وہ مستاجر کی محنت کو غصب نہ کرے، وہاں وہ مستاجر (مزدور) سے بھی کہتا ہے کہ وہ اپنی محنت کا معاوضہ لینے کا حقدار ہے۔ اگر محنت کئے بغیر معاوضہ کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ کمائی بھی حلال نہیں ہوگی۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ (۵۳/۳۹) اس کا بنیادی اصول ہے۔ یعنی انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ "کام چور" کی کمائی، حلال کی کمائی نہیں کہلا سکتی۔

جو کچھ اوپر آجر اور مستاجر کے متعلق کہا گیا ہے اس کا اطلاق ملازمت پیشہ حضرات پر بھی یکساں ہوتا ہے۔ وہ بھی اُجرت ہی پر کام کرتے ہیں جسے تنخواہ کہا جاتا ہے۔

(۰)

تطفیف

بات چلی تھی ماپ تول کے پیمانوں سے۔ اس ضمن میں آجر اور مستاجر کے معاملہ کا ذکر آ گیا۔ قرآن کریم میں ایک سورۃ ہے جس کا عنوان ہے۔ المطففین۔ تطفیف کے لغوی معنی ہیں پیالہ کو پورا پورا نہ بھرنا۔ اس میں کچھ کمی کر دینا۔ نیز اس کے معنی ہوتے ہیں "اونٹنی کے پاؤں اس طرح باندھ دینا کہ وہ پوری رفتار سے نہ چل سکے"۔ ایسا کرنے والے کون لوگ ہوتے ہیں اور ان کا انجام کیا ہوتا ہے اسے قرآن کریم نے خود ہی واضح کر دیا۔ فرمایا۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ۔ تطفیف کی ذہنیت اور روش اختیار کرنے والے تباہ ہو جاتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ۔ یہ

وہ ہیں کہ جب دوسروں سے اپنے واجبات وغیرہ لیتے ہیں تو پورے پورے لیتے ہیں۔ ذرا نہیں چھوڑتے۔ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ - (۸۳/۳) "لیکن جب دوسروں کے واجبات اور حقوق دیتے ہیں تو ڈنڈی مار جاتے ہیں"۔ اس آیت میں کالوھم اور وزنوھم کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دوسروں کو دیتے وقت ماپ اور تول میں کمی کر دیتے ہیں، اور یہ معنی بھی چیزوں ہی کو نہیں۔ جب یہ خود انسانوں کو ماپتے اور تولتے ہیں تو ان کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق صلہ نہیں دیتے۔ کوشش کرتے ہیں کہ انہیں کم از کم دیا جائے اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کی نمود کر سکیں۔ وہ ان کے "پاؤں باندھ کر" رکھتے ہیں۔ یہ بھی دوسروں کی محنت اور صلاحیتوں کے استحصال (EXPLOITATION) کا ایک طریق ہے جو آجکل کے صنعتی دور کی عام روش ہے۔ اس طریق سے حاصل کردہ دولت بھی رزقِ حرام کے زمرہ میں شامل ہوگی۔

—— (٠) ——

خیانت

یہاں تک گفتگو ان معاملات کے بارے میں تھی جن میں دو فریق شامل ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے ان معاملات کا بھی ذکر کیا ہے جن میں ایک ہی شخص ملوث ہوتا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ: (لَا) تَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ (۸/۲۷) "جو امانتیں تمہارے سپرد کی جائیں ان میں خیانت مت کرو"۔ امانت صرف وہی نہیں جیسے ایک شخص کسی دوسرے شخص کے پاس بغرضِ حفاظت رکھ دے۔ اس میں وہ تمام روپیہ یا مال اسباب وغیرہ شامل ہے جو حکومت، یا کوئی ادارہ یا فرم اپنے کسی ذمہ دار افسر کو کسی پراجیکٹ کی تکمیل کے لئے دیتی ہے۔ یا جو روپیہ ویسے ہی اس کی تحویل میں رہتا ہے۔ جیسے خزانچی یا بینک کے افسر۔ اس روپیہ میں کسی قسم کی بددیانتی، خیانت ہے اور بدترین جرم۔ اس قسم کی کمائی یکسر حرام ہے۔

—— (٠) ——

حلال و طیّب

رزق حلال و حرام کے سلسلہ میں قرآن کریم بہت دور تک جاتا ہے۔ اس نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ: وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ (۵/۸۸) "جو حلال رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے کہ اسے طیب طریق سے کھاؤ اور اس طرح اس خدا کے حکم کی نگہداشت کرو جس پر تم ایمان لانے کے مدعی ہو"۔ رزق حلال کو طیب طور پر کھاؤ۔۔۔ یہ نکتہ غور طلب ہے۔ اسے ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ بکرا حلال جانور ہے،

لیکن اگر اسے خدا کا نام لے کر ذبح نہ کیا جائے تو اس کا گوشت حلال نہیں رہتا حرام ہو جاتا ہے۔ یہاں تک تو سب متفق ہیں اور ہم اس کی بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی کا بکرا چرا کر اسے صحیح طریق سے ذبح کر لیا جائے تو کیا وہ حلال رہے گا؟ قرآن کریم کا فیصلہ ہے کہ وہ حلال نہیں رہے گا۔ کیونکہ ناجائز طریق سے حاصل کئے جانے کی وجہ سے وہ طیب نہیں رہا۔ لہٰذا جو چیزیں اپنی اصل کے اعتبار سے حلال ہیں اگر انہیں ناجائز طریق سے حاصل کیا جائے تو وہ طیب نہیں رہتیں، اس لئے حرام ہو جاتی ہیں۔ حلال کے لئے طیب ہونا شرط ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا اُحِلَّ لَهُمْ ۔ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ (۵/۴)۔ اے رسول! یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ نے ان کے لئے کیا کچھ حلال قرار دیا ہے، ان سے کہو کہ اس نے طیبات کو حلال قرار دیا ہے۔ یعنی ان حلال چیزوں کو جو ناجائز طریق سے حاصل کی گئی ہوں۔

• حلال اور طیب" کی جامعیت کے طور پر قرآن مجید میں ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔ (۲/۱۶۸) "اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال ہے اسے طیب طریق سے کھاؤ۔ اسے غیر طیب طریق سے کھانے سے تم شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کرو گے۔ یاد رکھو! شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے"۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ناجائز طریق سے حاصل کردہ دولت سے جو کچھ بھی تم خریدو گے، وہ اگر اپنی اصل کے اعتبار سے حلال بھی ہو تو بھی حرام ہو جائے گا۔ حلال وہی چیزیں ہوں گی جنہیں حلال کی کمائی سے حاصل کیا جائے۔ اسی کو قرآن مجید نے رزقِ کریم (۸/۴ ؛ ۸/۷۴) کہا ہے۔ یعنی "عزّت کی روٹی" اس کی وضاحت کرتے ہوئے دوسری جگہ کہا

عزّت کی روٹی

کہ خبیث (ناجائز کمائی سے حاصل کردہ) چیزیں کھانے والے خود خبیث ہوتے ہیں اور طیب چیزیں کھانے والے طیب۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۲۴/۲۶)۔ یہی (طیب لوگ) ہیں جو تباہی سے محفوظ رہتے ہیں، اور جنہیں عزّت کی روٹی ملتی ہے۔

———(۰)———

تکاثر

ان تصریحات کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ لوگ ناجائز طریقے اسی لئے اختیار کرتے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ دولت سمیٹنے کی دوڑ (RACE) میں ایک دوسرے سے آگے نکل جائیں۔ اسے عربی زبان میں "تکاثر" کہتے ہیں جو قرآن کریم کی ایک سورۃ کا عنوان ہے۔ اسی میں کہا گیا ہے کہ: اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۔ (۱۰۲/۱-۲) دولت سمیٹنے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس انسان کو زندگی کے صحیح مقاصد کی طرف سے غافل کر دیتی ہے۔

اور یہ دوڑ کہیں ختم نہیں ہوتی۔ یہ قبر تک چلی جاتی ہے۔ ضروریات کی ایک حد ہوتی ہے لیکن جب جذبہ محض دولت سمیٹنا ہو اور اس میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس، تو اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ وہ انسان کو پاگل کر دیتی ہے۔ یہ وہ پاگل پن ہے جس میں جائز اور ناجائز کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ ایسے لوگوں کا مقصدِ حیات جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (۱۰۴/۲) رہ جاتا ہے۔ یعنی "دولت جمع کرتے چلے جانا اور پھر اُسے گنتے رہنا" بس یہ ہوتی ہے ان کی زندگی! یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ (۱۰۴/۳) ایسا انسان اس خیالِ خام میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کا مال اسے حیاتِ جاوید عطا کر دے گا۔ کَلَّا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ مال و دولت اُسے جہنم رسید کر کے ریزہ ریزہ کر دے گا۔ (۱۰۴/۴-۹) ناجائز کمائی سے جمع کردہ مال و دولت انسان کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی (۹۲/۱۱) جب تباہی اس کے سامنے آئے گی تو وہ کہے گا کہ میں اپنی دولت کو بڑی قوت کا باعث سمجھتا تھا لیکن هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ (۶۹/۲۹) قوت کا یہی زعیم باطل مجھے لے ڈوبا اور کوئی یار و مددگار میرے کام نہ آیا (۶۹/۳۵)۔

انسان اکثر و بیشتر اولاد کی خاطر کمائی کے ناجائز طریقے اختیار کرتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ: وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸/۲۸)۔ یاد رکھو! اس طرح حاصل کردہ مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے فتنہ بن جاتے ہیں۔ اس سے بچو۔

(۰)

حلال اور حرام کمائی کے ضمن میں جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ رزقِ حلال وہ ہے جو ان طریقوں سے حاصل کیا جائے جنہیں قرآنِ کریم جائز قرار دیتا ہے۔ اسے وہ حق کہہ کر پکارتا ہے۔ اور رزقِ حرام وہ ہے جو ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے۔ اسے وہ باطل کہتا ہے۔ حق و باطل (حرام اور حلال) کے متعلق اس کا فیصلہ ہے کہ:-

وَیَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَیُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۴۲/۲۴)

خدا کا قانونِ مکافات یہ ہے کہ حق باقی رہتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے۔ باطل کے جواز میں تم کتنے ہی عذر پیش کرو، وہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ خدا تمہارے دل میں چھپے ہوئے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔

لہٰذا، خدا پر ایمان رکھنے والے، ناجائز کمائی کا خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ ہمارے ہاں اس قسم کی بحثیں تو عام ہوتی ہیں کہ کونسا حلال ہے یا حرام۔ اے کاش! اس قسم کی بحثوں میں اُلجھنے والے مسلمانوں کو یہ بھی بتاتے کہ ناجائز کمائی سے حلال بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کا حرام جس طرح سؤر کا گوشت حرام ہے۔ جس دن یہ حقیقت ہمارا جزوِ ایمان بن گئی، معاشرہ سے (CORRUPTION) اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے سوا اصلاحِ معاشرہ کی کوئی

صورت نہیں۔

(۰)

ایک کہانی

رزقِ حلال سے، معاشرہ کی خرابیوں ہی کا استیصال نہیں ہوتا۔ اس سے افراد کے کیریکٹر میں اس قدر پختگی اور بلندی پیدا ہو جاتی ہے جس کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں ہمیں بچپن میں ایک کہانی پڑھائی جایا کرتی تھی جو بڑی پُر معنی تھی۔ محمود غزنوی جب ہندوستان پر حملہ کے لئے آیا تو اس کی فوج میں ایک بیوہ کا نوجوان بیٹا بھی سپاہی تھا۔ جب اس کی فوج فاتح و منصور واپس گئی تو وہ بڑھیا اپنے بیٹے کی تلاش میں لشکر میں آئی۔ اس کے بیٹے کے ساتھیوں نے اس سے کہا کہ تمہارا بیٹا تو میدانِ جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ اس کی موت کس طرح واقعہ ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ اٹھا۔ دشمن کا تیر اس کی پشت میں لگا اور وہ مر گیا۔ اس بڑھیا نے کہا کہ یہ تو درست ہو سکتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں شہید ہو گیا ہو لیکن اسے میں کسی صورت میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ اٹھا تھا اور اس کی پشت میں تیر لگا تھا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس نے دشمن کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سینے پر تیر کھایا ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ مائی! تم تو میدانِ جنگ میں تھی نہیں۔ تم یہ بات اس حتم و یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہو؟ اس نے کہا کہ اس لئے کہ میں نے اس کے حلق میں حرام کے دودھ کا ایک قطرہ بھی ٹپکنے نہیں دیا تھا۔ جس بچے کی پرورش رزقِ حلال پر ہوئی ہو، ناممکن ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے۔

بات بڑھتے بڑھتے سلطان تک پہنچی۔ اس نے تحقیق کرائی تو بڑھیا کی بات سچ نکلی۔ اس سپاہی نے اپنے سینے پر تیر کھا کر جان دی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے یہ غلط بیانی ہنسی مذاق کے طور پر کی تھی۔

یہ کہانی تاریخی اعتبار سے کیسی ہی ہو، حقیقت کے اعتبار سے بالکل سچی ہے۔ رزقِ حلال سے انسان کے اندر، حق گوئی و بیباکی اور جرأت و بسالت کی وہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اور جو قوم اس قسم کے افراد پر مشتمل ہو گی اسے دنیا میں کون شکست دے سکتا ہے؟ اسی حقیقت کے پیشِ نظر تو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی!

حرام کی کمائی سے افراد اور قوم میں بلندیوں کی طرف جانے کی صلاحیتیں ہی سلب ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس فرد یا قوم کو حرام کی کمائی کا چسکا پڑ جائے، وہ محنت کرنے سے جی چراتی

ہے اور جب یہ عادت (یعنی محنت کے بغیر مال و دولت حاصل کرنے کی روش) پختہ ہو جائے تو محنت کرنے کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے باطل (ناجائز) کمائی کو اثم کہہ کر پکارا ہے۔ ($\frac{۲}{۱۸۸}$) اثم کے معنی ہیں ایسی روش جس سے قوائے عملیہ میں اضمحلال واقع ہو جائے اور انسان اپنے ساتھیوں سے پچھڑ کر پیچھے رہ جائے۔ اسی طرح قرآنِ کریم نے مَیْسِرْ کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔ ($\frac{۲}{۲۱۹}$)۔ ہمارے ہاں میسرہ کا عام ترجمہ جُوا کیا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ جُوا بھی میسرہ میں شامل ہے لیکن اس لفظ کا اطلاق صرف جُوا پر نہیں ہوتا۔ اس لفظ کا مادہ یسر ہے اور یسار کے معنی بایاں ہاتھ ہیں۔ جس طرح ہم اپنے ہاں ہر آسان کام کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اسی طرح ہر وہ کمائی جو محنت اور مشقت کے بغیر (ناجائز طریق سے) بآسانی حاصل ہو جائے وہ میسرہ میں شامل ہوگی۔ ایسی کمائی کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ؛ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ($\frac{۲}{۲۱۹}$) اس سے دولت تو ضرور اکٹھی ہو جاتی ہے لیکن انسان کے قوائے عملیہ میں اضمحلال واقع ہو جاتا ہے اور إِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا۔ ($\frac{۲}{۲۱۹}$) اور قوائے عملیہ میں اضمحلال واقع ہو جانے سے جو نقصان ہوتا ہے وہ اس فائدہ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو اس طرح دولت حاصل کرنے سے ہوتا ہے۔

یہ ہے وجہ جو ناجائز کمائی سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس سے "پرواز میں کوتاہی" واقع ہو جاتی ہے۔ اور جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آجاتی ہو اس سے (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) موت ہزار درجہ بہتر ہوتی ہے۔ چوری، فریب دہی، گراں فروشی، ذخیرہ اندوزی، جیب تراشی، رشوت ستانی، خیانت، بددیانتی یا شبا شب کروڑ پتی بن جانے کی ہوس۔ یہ سب اثم اور میسرہ (محنت سے جی چرانے) کے شجرِ خبیثہ کے برگ و بار ہیں اور ان کا علاج رزقِ حلال ہے

گر جہاں داند حرامش را حرام
تا قیامت پختہ ماند ایں نظام! (اقبالؒ)

جو قوم، قرآنِ کریم کے حرام قرار دادہ رزق کو حرام سمجھ لے اس کا نظامِ حیات قیامت تک محکم اور استوار رہے گا۔

(o)

قرآنی قوانین

پرویز صاحب کی تازہ کتاب جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآنِ کریم ایک مسلمان کی زندگی کے لئے کونسی حدود اور ضوابط مقرر کرتا ہے۔ اس میں آیات کے ساتھ مفہوم بھی دیا گیا ہے۔ قیمت مجلد بیس (۲۰/-) روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم

(ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور)

شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے

۱- من و یزداں

خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ قرآن، دیگر اہلِ مذاہب کے خدا پر ایمان کو ایمان کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن، خدا کا کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس خدا کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے۔ قیمت مجلد بتیس ۳۲/- روپے

۲- ابلیس و آدم

پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا۔ قصۂ آدم کا مفہوم کیا ہے۔ ابلیس و آدم کی کش مکش۔ شیطان۔ ملائکہ۔ جنات۔ وحی۔ نبوت۔ رسالت، جیسے اہم بنیادی نظریات کا صحیح تصور، علوم حاضرہ کی روشنی میں۔ قیمت مجلد پچیس ۲۵/- روپے

۳- جوئے نور

حضرات انبیاء کرامؑ اور اقوامِ سابقہ کی سرگذشتیں، آسمانی انقلاب کے خلاف، مفاد پرست گروہوں کا محاذ۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داروں کی تباہ کاریاں۔ (حضرت نوحؑ سے حضرت شعیبؑ تک)۔

قیمت مجلد پچیس ۲۵/- روپے

۴- برقِ طور

صاحب ضربِ کلیمؑ اور فرعونیت کی آویزش۔ داستانِ بنی اسرائیل۔ قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول۔ شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی۔ یہودی ذہنیت اور اس کا انجام۔ کیا یہودیوں کی مملکت کبھی قائم نہیں ہو سکتی؟ ارضِ مقدس کی داستان۔

قیمت مجلد:- پچیس ۲۵/- روپے

۵- شعلۂ مستور

حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات۔ کیا حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ کیا وہ زندہ آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ کیا وہ پھر سے زمین پر اتریں گے؟ واقعۂ تصلیب کی حقیقت کیا ہے۔ قرآن کریم اور علم حاضر کے محققین کے نزدیک۔ بصیرت افروز حقائق۔ حقیقت کشا معلومات۔

قیمت مجلد پچیس ۲۵/- روپے

۶- ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت

مقامِ نبوت کیا ہے؟ ختمِ نبوت کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے؟ سلسلۂ وحی کیوں بند کیا گیا؟ رسالتِ محمدیہ کس طرح ابدیت در کنار ہے۔ "آنے والے" کا عقیدہ کس طرح پیدا ہوا۔ "تحریکِ احمدیت" کی اصل و حقیقت اور غرض و غایت۔ "احمدی" لٹریچر کا بے لاگ تجزیہ اور نتیجہ۔ بڑی اہم کتاب ہے۔ قیمت مجلد پندرہ (۱۵) روپے

نوٹ:- ان قیمتوں میں محصول ڈاک شامل نہیں۔

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور — ملنے کا پتہ — (۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

قوم اور اُمّت

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت (بابت اکتوبر ۱۹۷۸ء) کے لمعات میں ہم نے میر غوث بخش بزنجو کے اس بیان کا نوٹس لیا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان میں ایک قوم نہیں بستی۔ یہاں چار قومیتیں ہیں جنہیں حقوقِ خود اختیاری حاصل ہونے چاہئیں۔ ہم نے لکھا تھا کہ بزنجو صاحب کے اس دعویٰ کا جواب انفرادی طور پر مقالات اور شذرات نہیں۔ اس کا تعلق مملکتِ پاکستان کی اصل و بنیاد سے ہے اس لئے یہ حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ آئینِ پاکستان کی روشنی میں اس کا نوٹس لے اور اس کے متعلق ضروری کارروائی کرے۔

طلوعِ اسلام کے بعض قارئین نے ہمیں کہا ہے کہ بزنجو صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ قرآنِ مجید میں بھی، مسلم قوم کا کوئی ذکر نہیں۔ مسلم اُمت کا ذکر ہے۔ اس لئے مسلم قومیت کا تصور غیر قرآنی ہے۔ ان حضرات کا مطالبہ ہے کہ بزنجو صاحب کے اس دعویٰ کا جواب طلوعِ اسلام میں ضرور دیا جانا چاہیئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس دعویٰ کا جواب طلوعِ اسلام کے ذمہ ہے لیکن ان حضرات کو (شاید) اس کا علم نہیں کہ طلوعِ اسلام اس اعتراض کا جواب ایک بار نہیں کئی بار دے چکا ہے۔ یہ بحث اس وقت چھڑی تھی جب (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبالؒ (مرحوم) کے درمیان، مسلم قومیت کے مسئلہ پر ۱۹۳۸ء میں معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ مولانا مدنی (مرحوم) نے بھی یہی اعتراض اٹھایا تھا۔ پاکستان میں یہ بحث متعدد بار اٹھی اور طلوعِ اسلام نے ہر بار اس کا جواب دیا۔ جب ۱۹۷۳ء میں بعینہٖ یہی سوال اٹھایا گیا کہ قرآنِ مجید میں اُمت کا لفظ آیا ہے، قوم کا نہیں، تو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۷۳ء کے لمعات میں اس پر تفصیلی بحث کی گئی۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان قارئین طلوعِ اسلام کے اطمینان کے لئے جن کی نظروں سے وہ لمعات نہیں گذرے، ان لمعات کو دوبارہ شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ انہیں درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے، مختصر الفاظ میں یہ بتا دینا بھی مناسب ہوگا کہ "قومیت" کا یہ تصور آیا کہاں سے ہے!

انگریز کی عملداری میں، ہندوستانی قوم یا مسلم قوم کا تصور ہی نہیں تھا۔ وہاں سرکاری کاغذات میں "قومیت" کے خانے میں ذات یا برادری لکھا جاتا تھا۔ مثلاً راجپوت۔ مغل۔ افغان۔ جاٹ۔ ارائیں وغیرہ۔ ان برادریوں کو قوم کہا جاتا تھا۔ اور لفظ قومیت سے مراد یہ ہوتی تھی کہ "تم کس قوم سے متعلق ہو"۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد پاکستانی قوم کا تصور وجود میں آیا اور قومیت یا (NATIONALITY) کے خانہ میں "پاکستانی" لکھا جانے لگا۔ ان خانوں میں سندھی۔ بلوچی۔ پنجابی۔ سرحدی نہیں لکھا جاتا تھا۔ قریب دس سال اُدھر کا ذکر ہے کہ ایک روسی (کمیونسٹ) فنڈ گرنے (NATIONALITIES IN PAKISTAN)

کے نام سے ایک کتاب شائع کر کے، اس مملکت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازش کا آغاز کیا۔ یہاں کے کمیونسٹوں نے اس فتنہ کو اچھالا۔ چنانچہ ۱۹۶۸ء میں کراچی کی ایک (گمنام سی) "عوامی ادبی انجمن" کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا۔ جس پر، علاوہ دیگر دانشوران قوم" جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس انجمن نے اس فتنہ کو تحریک کی شکل دینی چاہی تھی۔ طلوعِ اسلام نے اس سازش کا بھرپور تعاقب کیا جس سے یہ فتنہ بظاہر دب گیا لیکن اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ مسٹر بزنجو یا مسٹر مینگل کی طرف سے اس قسم کی آوازیں اس فتنہ کی صدائے بازگشت ہیں۔ اس تمہیدی تعارف کے بعد ہم، ان لمعات کو درجِ ذیل کرتے ہیں۔ جو "قوم اور اُمت" کے عنوان سے جولائی ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئے تھے۔

قوم اور اُمّت

ہمارا دور بھی عجیب و غریب ہے۔ اس میں لوگ مسلمان ہونے کے مدعی بھی ہوتے ہیں اور اسلام کے (فروعات نہیں بلکہ) مسلمات سے انکار بھی کرتے ہیں ـــــ انکار ہی نہیں کرتے بلکہ اس انکار پر اصرار کرتے ہیں، اور اپنے اس انکار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے بحث بھی کرتے ہیں۔

اسلام کے بنیادی مسلمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے پوری نوعِ انسان کی تقسیم دو گروہوں میں کی ہے اور اس تقسیم کا معیار کفر اور ایمان ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ۔ (۶۴/۲) خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ کفار کا ہے اور ایک گروہ مومنین کا ـــــ اس معیارِ تقسیم و تفریق کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام مسلم ایک گروہ کے افراد ہیں اور غیر مسلم دوسرے گروہ کے افراد۔ اسی کو (دورِ حاضر کی اصطلاح میں) دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ اس نظریہ کی رُو سے، دنیا کے تمام مسلمان ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ اسے مسلم قومیت کہا جاتا ہے۔

جب ہم اس قرآنی نظریۂ تقسیم کو پیش کرتے ہیں تو اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر اس نظریہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ (مثلاً) پاکستان اور افغانستان میں دو الگ الگ قومیں نہیں بستیں۔ یہ ایک ہی قوم ہے۔ اور اس سے آگے یہ کہ پاکستان اور افغانستان کیا اس نظریہ کی رو سے، تمام مسلم ممالک میں بسنے والے افراد ایک قوم ہیں۔ اور یہ بات خلافِ حقیقت ہے۔ مختلف اسلامی ممالک کے مسلمان الگ الگ قومیں ہیں۔ اور چونکہ وہ الگ الگ قومیں ہیں، اس لئے اس سے واضح ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک نہیں، وطن کا اشتراک ہے۔ لہٰذا یہ دعویٰ غلط ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار، ایمان کا اشتراک ہے۔

آپ نے اس منطق کے صغریٰ و کبریٰ پر غور فرمایا؟ وہ صغریٰ دعویٰ یہ ہے کہ چونکہ اس وقت مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو الگ الگ قوم سمجھتے ہیں، اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام کی رو سے معیارِ قومیت، ایمان کا اشتراک ہے۔

یعنی ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی نصِ صریح کی رُو سے، معیارِ قومیت کفر اور اسلام کا اختلاف ہے۔ اور ان حضرات کا ارشاد ہے کہ چونکہ موجودہ مسلمانوں کا عمل اس کے خلاف ہے، اس لئے یہ دعویٰ غلط ہے کہ اسلام کی رُو سے معیارِ قومیت، ایمان کا اشتراک ہے! ذرا اس دلیل کو آگے بڑھائیے اور دیکھئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے! قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ ..... الخ (۳۰/۳۱-۳۲)

مسلمانو! تم اسلام لانے کے بعد پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے۔

اور آپ اس کی تردید میں کہتے ہیں کہ نہیں! چونکہ مسلمانوں میں ہر جگہ فرقے موجود ہیں اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں فرقہ سازی شرک ہے۔

یا یہ کہ قرآن کریم میں ہے :-

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں۔

اور آپ کہتے ہیں کہ اس وقت کوئی اسلامی مملکت بھی ایسی نہیں جہاں حکومت کتاب اللہ کے مطابق قائم ہو۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

یہ ہے منطقی نتیجہ اس دلیل کا کہ چونکہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو الگ الگ قومیں سمجھتے ہیں اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں معیارِ قومیت' ایمان کا اشتراک ہے۔ یعنی ان حضرات کے نزدیک غلط اور صحیح کا معیار مسلمانوں کا موجودہ عمل ہے نہ کہ قرآن کریم کا فیصلہ۔ اس دلیل کا بودہ پن کسی دلیل کا محتاج نہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے نوعِ انسان کے دو ہی گروہ ہیں۔ کافر اور مومن۔ سوال یہ ہے کہ اس معیارِ تقسیم کی رُو سے ایمان کے اشتراک کی بنا پر جو "گروہ" وجود میں آتا ہے اس کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

(۱) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمت بنایا تاکہ تم نوعِ انسان کے اعمال کے نگران ہو اور رسول تمہارے اعمال کا نگران رہے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح سے جو اُمت وجود میں آئی تھی۔ وہ کسی خاص خطۂ زمین میں بسنے والے مسلمانوں پر مشتمل تھی یا ساری دنیا میں بسنے والے مسلمانوں پر؟ اس آیت میں جَعَلْنٰكُمْ اور عَلَيْكُمْ میں (كُمْ) کی ضمیر کا اطلاق کسی خاص وطن کے مسلمانوں پر ہوتا تھا یا تمام دنیا میں بسنے والے مسلمانوں پر؟ اس میں شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کا فریضہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا تھا یا کسی خاص خطۂ ارض میں بسنے والے مسلمانوں کا! اس میں رسول کی نگرانی کسی خاص ملک کے مسلمانوں تک محدود تھی یا ساری دنیا کے مسلمان اس کے احاطہ میں آجاتے تھے! فرمایئے کہ اس میں وہ کونسا عنصر تھا جو کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں سے الگ کرتا تھا۔ اس آیت کی رُو سے خدا نے ایک اُمت تشکیل کی تھی۔ اُمم متشکل نہیں کی تھیں۔ اس نے کہیں بھی اُمتِ عربیہ، اُمتِ مصریہ، اُمتِ ایرانیہ، امتِ عراقیہ وغیرہ نہیں کہا تھا۔

(۲) اس نے دوسری جگہ کہا ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ۔ ۔ ۔ ۔ (۳/۱۰۹) تم ایک بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔ اس میں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ كُنْتُمْ (تم) کی ضمیر کسی خاص خطۂ زمین کے مسلمانوں کے لئے ہے یا تمام دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے! یہ جو النّاس کی منفعت کے لئے اُمت کی تشکیل کی گئی تھی وہ کسی خاص وطن میں محصور تھی یا ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی!

(۳) قرآن کریم کہتا ہے کہ ایمان کے اشتراک کی بنا پر جو اُمت وجود میں آتی ہے، وہ مکان کے اعتبار ہی سے حدود فراموش نہیں ہوتی، زمان کے اعتبار سے بھی قیود ناآشنا ہوتی ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ کسی ایک زمانے میں مختلف ممالک میں بسنے

والے مومن، ایک اُمت کے افراد ہوتے ہیں بلکہ اس نظریہ پر ایمان رکھنے والے دنیا میں جب بھی اور جہاں بھی ہو گزرے ہیں، وہ سب ایک ہی امت کے افراد تھے۔ اس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں، مختلف ممالک میں پیدا ہونے والے حضرات انبیاء کرامؑ کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ: اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱/۹۲ ز ۲۳/۵۲) یہ سب ایک ہی اُمت تھے، اور ان کے ایک اُمت ہونے کی بنیاد یہ تھی کہ وہ ایک ہی خدا کی محکومیت اختیار کئے ہوئے تھے۔ واضح رہے کہ چونکہ اُمت کی تشکیل اس کے نبیؐ کی نسبت سے ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم نے جو مختلف انبیاء کرام کا ذکر کر کے انہیں اُمت واحدہ قرار دیا ہے تو اس سے مفہوم یہی ہے کہ ان کے متبعین ایک ہی اُمت کے افراد تھے۔ اس سے واضح ہے کہ کسی ایک خطۂ زمین کے، ایک ہی زمانہ کے مومن ہی ایک اُمت نہیں، اس اصول کو ماننے والے شروع سے آج تک ایک ہی اُمت کے افراد ہیں۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس اُمت کا نام بھی شروع سے آج تک ایک ہی رہا ہے۔ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (۲۲/۷۸) اس نے اس سے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی یہی نام رکھا گیا ہے۔ لہٰذا حضرت نوحؑ سے لے کر آج تک جن لوگوں نے بھی ایمان کے اشتراک کو معیارِ قومیت تسلیم کر لیا، وہ اُمتِ مسلمہ کے افراد قرار پا گئے، بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ کس زمانے میں گزرے ہیں اور کونسے ملک میں بستے تھے۔

(۱۷) قرآن کریم نے انہیں اُمت کہہ کر ہی نہیں پکارا۔ وہ ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب اِخْوَةٌ (بھائی بھائی) ہیں۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ:۔

> تم حبل اللہ (کتاب اللہ) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ اور یوں اپنی نعمت سے تمہیں باہمی بھائی بھائی بنا دیا۔ (۳/۱۰۳)

ظاہر ہے کہ اس رشتۂ اخوت سے کسی ایک وطن کے مسلمان ہی پیوست نہیں۔ اس میں ساری دنیا کے مسلمان منسلک ہیں۔ اور یہ رشتہ، اعتصام بحبل اللہ (قرآن سے وابستگی) یا ایمان ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ (۴۹/۱۰) حقیقت یہ ہے کہ (کسی ایک خطۂ زمین کے نہیں بلکہ ساری دنیا میں بسنے والے) مومن، ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اخوت کا رشتہ، قومیت کے رشتہ سے کہیں زیادہ عمیق اور مستحکم ہوتا ہے۔ یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں جس کا مطلب واضح ہے کہ اخوت کے اس رشتہ کی بنیاد، ایمان کا اشتراک ہے۔ جو لوگ ایمان میں ان سے مشترک نہیں وہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ اس میں داخل ہونا چاہیں تو وہ صرف ایمان لانے سے ہی ایسا کر سکتے ہیں۔ غور کیجئے۔ عرب کے رہنے والے غیر مسلم (مشرکین قریش) اور مسلمان، وطن۔ نسل۔ رنگ۔ زبان کے اشتراک کے باوجود، ایک اُمت کے افراد قرار نہیں پا سکتے۔ ان کے متعلق واضح الفاظ میں کہا گیا کہ: فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ .... (۹/۱۱) اگر یہ اپنی موجودہ کفر کی روش سے تائب ہو کر تمہارے ساتھ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے فریضہ میں شریک ہو جائیں تو پھر یہ "دین میں تمہارے بھائی" بن سکتے ہیں۔ یعنی ان کے اور تمہارے درمیان تمام مشترک عناصر (نسل، رنگ، زبان، وطن وغیرہ کا اشتراک) انہیں تمہارا بھائی نہیں بنا سکتا ـــــ حالانکہ ان میں سے اکثر و بیشتر خونی رشتہ کی بنا پر بھی بعض مسلمانوں کے بھائی تھے۔ یہ دین کے اشتراک کی بنا پر تمہارے بھائی بن سکتے ہیں۔

اور یہ رشتۂ اخوت کسی ایک دور کے مؤمنین تک ہی محدود نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، یہ گزرے ہوئے زمانے کے

مومنین تک کو بھی محیط ہے۔ چنانچہ قرآن نے ہر دور کے مسلمانوں سے کہا ہے کہ ان کی دعا یہ ہونی چاہیئے کہ: رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ۔ (۵۹/۱۰) اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ہمیں بھی مغفرت عطا فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی، جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ایمان کے ساتھ اشتراک کی بنا پر متشکل ہونے والی اُمت، کس طرح زمان اور مکان کے حدود سے ماورا ہوتی ہے۔ اور ان میں باہمی رشتہ قومیت ہی کا نہیں ہوتا، اس سے کہیں گہرا اخوت کا رشتہ ہوتا ہے۔

(۰)

آپ یقیناً حیران ہونگے کہ قرآن کریم کی اس قدر واضح تعلیم کی موجودگی میں، وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دینے والے "مسلمان" اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل کیا لاتے ہیں۔ وہ بھی سن لیجئے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ قرآن نے، ایمان کے اشتراک کی بنا پر اُمت بنائی ہے، قوم نہیں بنائی۔ ایمان کے اشتراک سے اُمت وجود میں آتی ہے، اور وطن کے اشتراک سے قوم۔ تحریک پاکستان کے دوران، دو قومی نظریہ کے مخالف یہی دلیل لایا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان، مذہب کی بنا پر ایک اُمت ہیں۔ لیکن ہندوستان میں بسنے کی بنا پر، وہ اور غیر مسلم، سب ایک (ہندوستانی) قوم کے افراد ہیں۔ اس دلیل کی بنا پر وہ کہا کرتے تھے کہ تمام دنیا کے مسلمان، مذہب کی بنا پر ایک اُمت ضرور ہیں، لیکن مختلف ملکوں کے باشندے ہونے کی بنا پر ان کی قومیتیں الگ الگ ہیں۔ اُمت اور قوم کی یہ تفریق درحقیقت مذہب اور دین کی تفریق پر مبنی ہے۔ مذہب میں واقعی یہ ہوتا ہے کہ ایک ملک کے باشندے اپنا الگ الگ مذہب رکھتے ہیں، لیکن قومیت ان سب کی ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن دین میں اس قسم کی ثنویت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ثنویت سیکولرازم کی پیدا کردہ ہے۔ دین میں اُمت اور قوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت کے حامی مسلمانوں کی فریب خوردگی یا مغالطہ آفرینی کی وجہ یہ تھی کہ مغرب سے آمدہ نیشن (NATION) کے لفظ کا ترجمہ قوم کیا گیا۔ اور اس کے بعد کہا گیا کہ قرآن نے مسلمانوں کو جداگانہ اُمت قرار دیا ہے، جداگانہ قوم نہیں قرار دیا۔ مذہب کے اعتبار سے، وہ غیر مسلموں سے الگ اُمت ہیں۔ لیکن سیاسی نقطۂ نگاہ سے، وہ اور غیر مسلم، مل کر ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ یہی وہ سیکولرازم یا ثنویت (DUALITY) تھی جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ: ؎

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب، کا کفن ہے!

اس میں شبہ نہیں کہ عربوں کے ہاں (جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا) اور زمانہ نزولِ قرآن میں، قوم کے لفظ نے وہ سیاسی مفہوم اختیار نہیں کیا تھا جو عصرِ حاضر میں مغربی تصورِ قومیت کی رو سے، آجکل رائج ہے (وہ تو بلکہ قوم میں عورتوں کو بھی شامل نہیں کیا کرتے تھے) لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم نے اس مقصد کے لئے اُمت کا لفظ ہی نہیں قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ قرآن کریم میں ہدایت و رحمت ہے۔ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۷/۵۲) ایمان لانے والی قوم کے لئے (دیگر کئی ایک مقامات پر بھی یہ الفاظ آئے ہیں) اس کے برعکس، سورۂ یونس میں ہے کہ خدا کی آیات اور تنبیہات کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں۔ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ (۱۰/۱۰۱) اس قوم کو جو ایمان نہیں لاتی، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے مسلم اور غیر مسلم کے لئے قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ پھر، ان کے لئے دو الگ الگ اصطلاحات بھی استعمال نہیں کیں بلکہ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان میں باہمی تعلقات کس قسم کے ہوں گے۔ غور سے دیکھئے۔ فرمایا:۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ

كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ..... (۵۸/۲۲)

تم کبھی ایسا نہیں دیکھو گے کہ جو قوم خدا اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے، وہ ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات قائم کرے جو خدا اور رسولؐ (یعنی اسلامی نظام) کی مخالفت کریں۔ خواہ وہ ان کے ماں باپ، اولاد، بھائی اور دیگر افرادِ خاندان ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ ہے ان دونوں قوموں میں اختلاف کی نوعیت! آپ محض اشتراکِ وطن کی بنا پر انہیں ایک قوم قرار دیتے ہیں اور قرآنِ کریم ایمان کے اختلاف کی وجہ سے باہمی رشتہ داریوں تک کے تعلقات بھی منقطع کر دیتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اس کے بعد ان دو متضاد نظریاتِ زندگی کے حامل افراد، ایک قوم کے افراد بن سکتے ہیں؟ واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے، ہر غیر مسلم "خدا اور رسولؐ (اسلامی نظام) کا مخالف ہوتا ہے۔ کافر و مومن کا ایک قوم کے افراد قرار پانا تو ایک طرف، قوم مومنین کو دعا یہ سکھائی گئی ہے کہ۔۔۔

فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ (۲/۲۸۶) ہمیں قومِ کافرین پر غلبہ و نصرت عطا فرما ——— فرمائیے! سینہ میں اس قسم کی آرزوئیں رکھنے اور ان کا اس طرح اعلان کرنے والے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں!

———(o)———

اس سلسلہ میں ایک دلیل اور بھی دی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ اگر ایک مومن سہواً، اور نادانستہ کسی مومن کو قتل کر دے تو اس کی دیت (خون بہا) دی جائے گی۔ قرآن نے اس خون بہا کی ادائیگی کا طریق بتاتے ہوئے کہا ہے کہ: فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۔ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ... (۴/۹۲) اگر مقتول مومن ہو لیکن اس قوم سے متعلق ہو جس کے ساتھ تمہاری عداوت ہے تو پھر دیت یوں دی جائے گی اور اگر اس قوم سے متعلق ہو جس کے ساتھ تمہارے معاہدانہ تعلقات ہیں تو پھر اس طرح ....." اس سے استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ دیکھئے قرآن اس کا امکان تسلیم کرتا ہے کہ ایک مومن، اس قوم کا فرد بھی ہو سکتا ہے جس کے ساتھ تمہارے دشمنی کے تعلقات ہوں یا میثاقی تعلقات۔ یہ قوم بہرحال غیر مسلموں کی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمان، غیر مسلموں کی قوم کے افراد بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ دلیل، یوں ہی سمجھئے، جیسے کوئی شخص ڈوبنے سے بچنے کے لئے تنکوں کے پل بنائے۔ ایسا کہنے والے یہ قطعاً بھول جاتے ہیں کہ وہ حالات کیا تھے جن میں قرآن نے ایسا کہا تھا؟ ابتدائے اسلام میں کیفیت یہ تھی کہ مختلف قبائل میں اکا دکا لوگ ایمان لے آتے تھے۔ وہ مسلمان تو ہو جاتے تھے لیکن رہتے تھے اپنے ہی قبیلہ میں۔ ان کے لئے ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا۔ خود مکہ کے مسلمان اسی مکہ میں، اسی قوم قریش میں رہتے تھے۔ یہی کیفیت مختلف قبائل میں رہنے والے مسلمانوں کی تھی۔ مندرجہ بالا آیت میں دیت کے متعلق جو احکام دیئے گئے ہیں، وہ ایسے ہی مسلمانوں کے متعلق ہیں۔

اس کے بعد جب ایک ایسا مقام میسر آ گیا جہاں اسلامی مملکت کے قیام کے امکانات روشن تھے (یعنی مدینہ) تو مکہ کی جماعت ہجرت کر کے وہاں منتقل ہو گئی۔ جب وہاں اپنی آزاد مملکت قائم ہو گئی تو جہاں جہاں بھی مسلمان بستے تھے ان سے کہہ دیا کہ وہ بھی ہجرت کر کے مدینہ آ جائیں۔ ان میں بعض ایسے تھے جنہیں دشمنوں نے اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ وہ وہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔ انہیں اس حکم سے مستثنےٰ قرار دے کر کہا گیا کہ وہ انتظار کریں

تاآنکہ وہاں سے منتقل کرانے کا انتظام کیا جا سکے۔ اس دوران میں ان کی ہر ممکن اعانت اور خبر گیری کا خیال رکھا جائے گا۔ یعنی وہ لوگ تھے جو وہاں سے نکلنے کے لئے ہر وقت مضطرب و بے قرار رہتے تھے لیکن بامر مجبوری ایسا کر نہیں پا سکتے تھے۔ (۴/۹۷ ؛ ۴/۹۸) اور یہی وہ تھے جنہیں وہاں سے نکالنے کے لئے آخر الامر مملکتِ اسلامیہ کو جنگ کا حکم دیا گیا۔ (۴/۷۵)۔

کچھ لوگ (مسلمان) ایسے بھی تھے جنہیں ہجرت کے امکانات حاصل تھے لیکن وہ وہاں سے آنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں آپ (علمائے حاضر کی اصطلاح میں) "متحدہ قومیت" کے حامی کہہ سکتے ہیں یعنی یہ "مذہب" کی حیثیت سے تو مسلمان رہنا چاہتے تھے لیکن اپنی قومی حیثیت، وطنی یا نسلی رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے ان کے متعلق کیا کہا ہے؟ یہ کہا کہ یہ لوگ منافق ہیں۔ چاہتے یہ ہیں کہ جس طرح خود دعویٰ ایمان کے باوجود کافر کے کافر رہنا پسند کرتے ہیں تمہیں بھی کافر بنا دیں۔ فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۴/۸۹) انہیں کبھی اپنا دوست نہ سمجھو تا وقتیکہ یہ وہاں کے لوگوں سے قطع تعلق کر کے تمہارے ہاں نہ آ جائیں۔ اور اگر یہ یہاں آنے کے بعد پھر اپنی سابقہ قومیت کی طرف پلٹنا چاہیں تو ان سے بھی اسی طرح جنگ کرو جس طرح دوسرے دشمنوں سے جنگ کی جاتی ہے (۴/۸۹) اس سے ذرا آگے جا کر کہا کہ موت کے وقت ان لوگوں سے ملائکہ پوچھیں گے کہ تم ان لوگوں میں کیوں رہتے، تو یہ جواب میں کہیں گے کہ ہم کیا کرتے۔ ہم مجبور تھے۔ جواب دیا جائے گا کہ تم مجبور کیوں تھے! خدا کی زمین وسیع تھی اور تمہیں نقلِ مکانی کے امکانات حاصل تھے۔ پھر یہ عذر کیسا؟ چنانچہ انہیں جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔ (۴/۹۷)

ہم ان حضرات سے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان کو مذہبی آزادی حاصل ہو تو وہ اشتراکِ وطن کی بنا پر غیر مسلموں کی قوم کا فرد بن کر رہ سکتا ہے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس پر غور کریں کہ جن مسلمانوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ مسلمان رہنا چاہتے تھے اور مسلمان رہنے میں انہیں کسی قسم کی دشواری بھی نہیں تھی۔ پھر وہ کونسی بات تھی جس کی بنا پر قرآن انہیں جہنمی قرار دے رہا ہے اور مسلمانوں سے کہہ رہا ہے کہ ان سے دوستانہ تعلقات ہرگز روا نہ رکھیں، اور اگر وہ اپنی روش پر اصرار کریں تو ان سے جنگ بھی کریں۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ (ان حضرات کے تصور کے مطابق) اُمّت اور قوم میں فرق کرتے تھے۔ وہ اُمّت کے اعتبار سے مسلمان رہنا چاہتے تھے لیکن قومیت کے لئے وطن یا نسل کو معیار قرار دیتے تھے۔ یہ وہ ثنویت تھی جس کی بنا پر قرآن انہیں مسلمان ہی تسلیم نہیں کرتا تھا۔

یہ ہے معیارِ قومیت کی اہمیت قرآن کی رُو سے جسے آجکل محض ایک سیاسی معاملہ تصوّر کر کے درخورِ اہمیت نہیں سمجھا جاتا۔

اب رہا یہ سوال کہ آجکل ساری دنیا کے مسلمانوں نے وطن یا نسل کو معیارِ قومیت قرار دے رکھا ہے۔ وطنی معیارِ قومیت کہیں نہیں، تو یہ مسلمانوں کا قصور ہے قرآن کا نہیں۔ تحریکِ پاکستان کا مقصود یہ تھا کہ آج جبکہ دنیا میں کہیں بھی اسلام کو معیارِ قومیت نہیں قرار دیا جا رہا، ایک مختصر سے خطۂ زمین ہی میں سہی، ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس کی بنیاد اسلام کے معیارِ قومیت پر ہو اور جس میں تمام فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق کئے جا سکیں۔ مقصد یہ تھا کہ یہ مملکت، اسلام کے احیاء کے لئے ذرّۂ اوّلیں (FIRST CRYSTAL) کا کام دے۔ جب اسلامی معیارِ قومیت کو یہاں عملاً نافذ کر دیا جائے تو پھر اس تجربہ کو آگے بڑھایا جائے اور رفتہ رفتہ دیگر اسلامی ممالک کو بھی اس راستے پر لایا جائے۔ منتہیٰ اس اسکیم کا یہی تھا کہ پھر سے ساری دنیا کے مسلمان اُمّتِ واحدہ (یعنی ایک قوم) کی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔

لیکن وائے بدنصیبی کہ ہم نے ایک مملکت تو حاصل کر لی لیکن زندگی یہاں بھی قرآنی قالب میں نہ ڈھل سکی۔ ہمارے لبوں پر الفاظ تو دو قومی نظریہ کے رہے لیکن عملاً معیارِ قومیت وطن کا اشتراک ہی رہا۔ پاکستان کی حدود میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایمان کے اختلاف و افتراق کی بنا پر دو قومیں نہیں بلکہ وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک ہی قوم تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یہ حالت ان کی ہے جو (زبان سے ہی سہی، بہرحال) دو قومی نظریہ کے مدعی ہیں۔ جو لوگ تقسیم سے پہلے، وطن کے اشتراک کی بنا پر قومیت کے قائل تھے۔ یہاں آکر ان کا "کفر" پہلے سے بھی زیادہ متشدد اور راسخ ہو گیا ہے۔ یعنی وہاں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیتے تھے، لیکن یہاں خود مسلمانوں کو چار قومیتوں میں تقسیم کر رہے ہیں! یا للعجب۔ یعنی ہندوستان میں وطن کے اشتراک کی بنا پر مسلم اور غیر مسلم ایک قوم اور یہاں اسی اشتراکِ وطن کے باوجود، خود مسلمانوں کی چار قومیں! اور اس پر اصرار یہ کہ یہ عین مطابقِ اسلام ہے۔ مطابقِ اسلام تو ایک طرف، یہ تو خود ان کے نظریۂ قومیت کے بھی مطابق نہیں۔ اس نظریہ کے مطابق ایک ملک کے باشندے ایک قوم قرار پاتے ہیں۔ اپنی اس روش (چار قومیتوں) کی تائید میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اسلام مسلمانوں کو اُمتِ واحدہ قرار دیتا ہے، واحد قوم نہیں قرار دیتا۔ مسلمان خواہ چار چھوڑ چار سو قوموں میں منقسم ہو جائیں، ان کی اُمت کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ ہم سمجھ نہیں سکتے کہ یہ "اُمت کی وحدت" ہے کیا بلا جو اختلافِ قومیت کے باوجود بستور قائم رہتی ہے اور اس کا عملی ماحصل کیا ہے؟ قرآن نے کہا تھا کہ اگر ایک مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دے تو وہ سیدھا جہنم میں چلا جاتا ہے۔ یہ تھا وحدتِ اُمت کا عملی نتیجہ۔ اب حالت یہ ہے کہ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں کا بلا دریغ قتلِ عام کرتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی ملک کے مسلمان، نسلی، صوبائی، لسانی حتیٰ کہ سیاسی اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں، اور اس کے باوجود ان کے اُمتِ واحدہ ہونے کے "عقیدہ" پر کوئی حرف نہیں آتا۔

یاد رکھیئے! آج کی اصطلاح میں جو مفہوم لفظ قوم (نیشن) کا ہے، قرآنی اصطلاح میں وہی مفہوم لفظ اُمت کا ہے جب اسے مسلمانوں کے لئے استعمال کیا جائے۔ وہ دنیا کے مسلمانوں کو ایک اُمت (یعنی ایک قوم) قرار دیتا ہے۔ اور جغرافیائی یا نسلی اور لسانی اختلافات ان کے ایک قوم ہونے کے راستے میں حائل نہیں ہوتے۔ اس اعتبار سے امت اور قوم میں فرق کرنا، خلافِ اسلام ہے۔ خلافِ راشدہ کے زمانے میں مسلمان مختلف ممالک میں آباد تھے۔ ان کی نسلیں بھی الگ الگ تھیں اور زبانیں بھی جدا جدا۔ حتیٰ کہ ان کا "کلچر" بھی ایک دوسرے سے الگ تھا۔ لیکن اس کے باوجود، وہ سب ایک قوم (اُمت) کے افراد تھے۔ ان کی قومیتیں مختلف نہیں تھیں۔ جو حضرات آجکل جغرافیائی یا نسلی، لسانی یا صوبائی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کو الگ الگ قومیں قرار دیتے ہیں، انہیں اس سے کون روک سکتا ہے۔ لیکن ان کی خدمت میں اتنا تو عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اندر اتنی اخلاقی جرأت پیدا کریں کہ اپنے اس تصور یا عمل کے متعلق اعتراف کریں کہ یہ خلافِ اسلام ہے۔ کسی نظریہ یا عمل کے خلاف یا مطابقِ اسلام ہونے کے لئے کوئی خارجی معیار ہونا چاہیئے اور مسلمان کے لئے وہ معیار کتاب اللہ کے سوا اور کونسا ہو سکتا ہے۔ کتاب اللہ کی رُو سے ساری دنیا کے مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کی قوم میں کوئی غیر مسلم شامل نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کے مسلّمات میں سے ہے۔

(۰)

باسمہ تعالیٰ

قرآن کی تعلیم ابدیت در کنار ہے

تقدیر شکن قوّت باقی ہے ابھی اس میں

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

قرآن کی تعلیم ابدیت در کنار ہے

تقدیر شکن قوّت باقی ہے ابھی اس میں

مملکتِ پاکستان اس لئے وجود میں لائی گئی تھی کہ یہ اسلام کی تجربہ گاہ بن سکے۔ "تجربہ گاہ بننے" سے مراد یہ تھی کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام، زمانۂ قدیم میں تو قابلِ عمل تھا لیکن اب ایک نئی دنیا وجود میں آچکی ہے۔ زمانے کے انداز بدل چکے ہیں انسانی تمدن اور عمرانیت کے طور طریق اور سے اور ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں اب عہدِ کہن کا کوئی نظام کامیاب نہیں ہو سکتا، ان لوگوں کو عملاً بتا دیا جائے کہ اسلامی نظام کی کیفیت یہ نہیں۔ اس کا مدار حقائقِ ابدی پر ہے جو نہ کبھی پرانے ہوئے ہیں، نہ فرسودہ۔ اس نظام میں آج بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل پیش کر سکے۔ اور وہی انسانیت ساز نتائج مرتب کر سکے جو اس نے آج سے چودہ سو سال پہلے برآمد کئے تھے۔ مملکتِ پاکستان اس امر کی زندہ شہادت پیش کرنے کے لئے وجود میں لائی گئی تھی۔

لیکن جب اس مملکت میں اسلام کے نام پر مختلف قسم کے کھیل کھیلے جانے لگے تو ہم نے ان حضرات سے کہا کہ ہمارے اس طرزِ عمل سے آشنا ہی نہیں ہوگا کہ یہ مملکت تباہ ہو جائے گی۔ اس سے اسلام کے متعلق دنیا کا بالعموم، اور خود اس مملکت کی نئی نسل کے دل میں اُبھرنے والا خیال بالخصوص پختگی اختیار کر لے گا کہ اب اس میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ یہ نوعِ انسان کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ پرویز صاحب کا مسلک اور مشن قرآنی حقائق کا عام کرنا اور دینِ خداوندی کی ابدیت کا دلوں میں ثبت کرنا ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر انہوں نے نومبر ۱۹۷۲ء میں منعقدہ طلوعِ اسلام کنونشن میں ایک نہایت بصیرت افروز خطاب پیش کیا جس کا عنوان تھا:-

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

اس خطاب کی عام اشاعت کی گئی اور اس نے فضا میں نہایت خوشگوار تاثر پیدا کیا۔ اس بات کو آٹھ سال ہو گئے اور اس عرصہ میں اس ملک میں جو کچھ اسلام کے نام سے ہوا اس نے ہماری نوجوان نسل کے دل میں اس خیال کو پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ ابھار دیا ہے کہ اسلام میں دوبارہ زندہ ہونے کی صلاحیت نہیں رہی۔ اس خیال کے عام ہونے سے جو تباہ کن نتائج پیدا ہو سکتے ہیں ان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ——— خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے ——— اس خدشہ

کے پیشِ نظر ضروری سمجھا گیا کہ پرویز صاحب کے اس خطاب کو ایک بار پھر عام کیا جائے۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ خطرات کے اس بے پناہ سیلاب کی روک تھام کے لئے طلوعِ اسلام کی یہ کوشش سدِ سکندری کی حیثیت نہیں رکھتی، لیکن ظاہر ہے کہ ہم اپنی امکانی وسعت کے مطابق ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ طلوعِ اسلام نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے نہ سیاسی پارٹی۔ نہ اس کی تحویل میں رزق کے سرچشمے ہیں نہ ذرائع ابلاغ۔ نہ اسے کہیں سے مالی امداد حاصل ہے نہ سازوبراق، ہم جو کچھ کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں وہ اپنی انفرادی استطاعت کے مطابق ہی کر سکتے ہیں۔ جذبۂ محرکہ اس کا صرف یہ ہے کہ جب حضور نبی اکرمؐ خدا کے حضور شکایت کریں گے کہ: یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا۔ (۲۵/۳۰) "اے میرے رب! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا" تو کم از کم ہمارا شمار ان سوختہ بختوں میں نہ ہو۔

اس تمہیدی تعارف کے بعد پرویز صاحب کا خطاب ملاحظہ فرمائیں۔

(۰)

خطاب

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت۔

ایک بات کچھ عرصہ سے میرے مشاہدے میں آ رہی تھی۔ اب اس نے کافی شدت اختیار کر لی تو میں نے ضروری سمجھا کہ اسے اپنی خلوت کی تنہائیوں سے نکال کر آپ حضرات کی جلوت گاہ میں لے آؤں۔ کنونشن کا یہ اجلاس اس کے لئے مناسب ترین موقعہ سمجھا گیا۔ میرے ہاں مغربی ممالک کے دانشور، وہاں کے مختلف علمی اور فکری اداروں کے ریسرچ سکالرز یا یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلباء، اسلام کے متعلق کچھ دریافت کرنے اور سمجھنے کے لئے آتے رہتے ہیں۔ میں اپنی بصیرت کے مطابق انہیں اسلام کے بنیادی اصول سمجھاتا ہوں تو وہ نہ صرف ان سے متفق ہوتے ہیں بلکہ اکثر ان کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ لیکن آخر میں وہ ایک سوال کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر اسلام ایسا ہی انسانیت ساز اور منفعت بخش نظامِ حیات تھا تو وہ تھوڑا سا عرصہ قائم رہنے کے بعد ناکام کیوں ہو گیا۔ وہ آگے کیوں نہ چلا! اب میں دیکھ رہا ہوں کہ یہی خیال ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی عام ہو رہا ہے، اور میرا اندازہ یہ ہے کہ اسے ایک خاص مقصد کے تحت منظم طور پر پھیلایا جا رہا ہے۔ مغربی مفکر اپنے خیال کا اظہار کچھ نرم انداز سے کرتے ہیں لیکن ہمارے یہ نوجوان بڑی جرأت و بیباکی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام نے تاریخ کے ایک خاص دور میں اس قسم کے درخشندہ نتائج پیدا کر دیئے تھے۔ لیکن اس کے بعد زمانہ آگے بڑھ گیا حالات بدل گئے۔ اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے، اب اس کی حیثیت ایک چلے ہوئے کارتوس سے

زیادہ کچھ نہیں۔ لہٰذا، ہمیں اس خوش فہمی سے نکل جانا چاہیئے کہ ہم اسلام کو ساتھ رکھتے ہوئے زندہ رہ سکتے اور ترقی کر سکتے ہیں۔ یہ ہیں وہ خیالات جن کا اظہار ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے بہ شدّ و مد کیا جاتا ہے۔ میں اپنے ان نونہالانِ ملت کے اس قسم کے خیالات پر نہ تو ناک بھوں چڑھایا کرتا ہوں، نہ ہی انہیں لاحول پڑھ کر دھتکارا کرتا ہوں۔ میں ان حالات کا جائزہ لیا کرتا ہوں جن کی بنا پر ان کا دل اس قسم کے وساوس کی آماجگاہ اور ان کا دماغ اس قسم کے شکوک کا مسکن بنا دیا جاتا ہے اور کوشش کیا کرتا ہوں کہ حقائق و بصائر کی رو سے انہیں اصل حقیقت سے آگاہ کروں اور دلائل و براہین کی بنیادوں پر ان کے شکوک و شبہات دور کروں۔ اس میں مجھے اکثر کامیابی ہوتی ہے۔ آج کی نشست میں، اس خطاب سے بھی میرا مقصود یہی ہے۔ اسی بنا پر میں نے اس کا عنوان بھی انہی نوجوانوں کے الفاظ سے مستعار لے لیا ہے۔

(۰)

اسلام کسے کہتے ہیں؟

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلام کہتے کسے ہیں؟ اس کائنات میں خدا کے متعین کردہ، غیر متبدل، اٹل قوانین کارفرما ہیں جن کے مطابق یہ کارگہِ عظیم اس حسن و خوبی کے ساتھ سرگرمِ عمل ہے۔ عام اصطلاح میں انہیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوانین کروڑہا کروڑ سالوں سے اسی طرح کارفرما چلے آ رہے ہیں۔ نہ یہ آج تک ناکام ثابت ہوئے ہیں، نہ تھک کر کسی مقام پر رُک گئے ہیں۔ نہ ہی ان کے نتائج و اثمار میں کسی قسم کا نقص یا خلفشار رونما ہوا ہے۔ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ۔ (۶۷/۳) تم تخلیقِ خداوندی میں کہیں کوئی خلل نہیں پاؤ گے۔

جس طرح خدا نے خارجی کائنات کے لئے اٹل قوانین متعین کئے ہیں، اسی طرح اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی ایسے محکم اصول اور مستقل اقدار مقرر کئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، افراد اور اقوام کو زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں اور انسانی معاشرہ سکون و اطمینان کا گہوارہ اور عروج و ارتقاء کا طیارہ بن جاتا ہے۔

لیکن اشیائے کائنات اور انسانی دنیا میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اشیائے کائنات ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ انہیں ان کی خلاف ورزی کا اختیار ہی نہیں۔

انسانی دُنیا

لیکن انسان کو صاحبِ ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا، اسے اس کا اختیار ہے کہ جی چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے ان سے سرکشی اختیار کر لے۔ جب کوئی قوم ان کے مطابق زندگی بسر کرے گی تو وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہوگی۔ جب وہ انہیں چھوڑ دے گی تو وہ ذلتوں اور پستیوں کے جہنم میں جا گرے گی۔ اگرچہ بات بالکل واضح ہے لیکن میں دو ایک مثالوں سے اس کی مزید وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ ایک مریض کسی ڈاکٹر سے علاج کراتا ہے اور اس کے نسخے سے اُسے آرام آنا شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے

بعد وہ اُس نسخہ کا استعمال چھوڑ دیتا ہے اور پھر بیمار ہو جاتا ہے۔ فرمائیے! اس سے کیا آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ نسخہ ناکام رہ گیا یا یہ کہیں گے اس مریض نے اس نسخہ کو چھوڑ کر مرض کو پھر بلا لیا؟

یا (مثلاً) ایک شخص کسی خاص مقام تک جانے کے لئے موٹر میں سوار ہوا۔ راستے میں اس نے موٹر کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ریسٹ ہاؤس میں جا کر سو گیا اور یوں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ نہ سکا۔ کہیئے آپ اس کے متعلق یہ کہیں گے کہ اس موٹر میں اس کی صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ اگلا راستہ طے کر سکتا یا اس مسافر کی تن آسانی کا ماتم کریں گے؟

یا (مثلاً) ایک شخص چھت پر جانے کے لئے سیڑھیوں پر چڑھا۔ لیکن نصف سیڑھیوں پر پہنچ کر پہلے بیٹھ گیا اور پھر نیچے اُتر آیا۔ فرمائیے! آپ اس پر یہ محاکمہ کریں گے کہ اس مکان کی سیڑھیاں بڑی نازک ہیں۔ جو کسی کو چھت تک لے جا نہیں سکتیں، یا اس شخص کی دوں ہمتی کو الزام دیں گے؟

یا (مثلاً) ہمارے ہاں "بائیں طرف چلو (KEEP TO THE LEFT) ٹریفک کا قانون ہے۔ گذشتہ ماہ تک ہمارا معاشرہ اس قانون کے مطابق چلتا رہا تو ٹریفک کا کوئی حادثہ نہ ہوا۔ یکم نومبر سے ہر راہرو یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ میں اس قانون کی پابندی نہیں کروں گا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ فرمائیے! کیا آپ اس سے یہ نتیجہ مرتب کریں گے کہ اکتوبر کے آخر تک تو اس قانون میں ٹریفک کے حادثات روکنے کی صلاحیت تھی لیکن اس کے بعد اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ یہ بالکل بے کار ہو گیا ہے!۔ یہ اس قابل تھا ہی نہیں کہ بڑھتی ہوئی ٹریفک کا ساتھ دے سکے۔

ان مثالوں کے بعد، عزیزانِ من! پھر اصل موضوع کی طرف آجائیے۔ اسلام نے زندگی کے کچھ اصول و قوانین دیئے۔ ایک قوم نے ان کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کیا۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کی درخشندگی اور تابناکی سے آج بھی تاریخ کے اوراق جگمگا رہے ہیں۔ مجھے اس باب میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اس سے وہ لوگ بھی انکار نہیں کرتے جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام آگے نہیں چل سکا۔ اس حد تک تو وہ بھی معترف ہیں کہ اسلام نے اس زمانے میں نہایت شاداب نتائج پیدا کئے تھے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس کے بعد اسلام میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ اس قسم کے نتائج پیدا کرتا چلا جائے۔ ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ:-

۱۔ کیا ایسا ہوا تھا کہ وہ قوم ان قوانین پر بدستور عمل پیرا رہی لیکن اس کے باوجود، وہ ان ثمر بار نتائج سے محروم ہو گئی جن سے وہ پہلے بہرہ یاب ہوئی تھی، یا اس نے ان قوانین کا اتباع چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے وہ ان نتائج سے محروم ہو گئی۔

۲۔ اگر واقعہ یہ ہو کہ وہ قوم ان قوانین کے مطابق بدستور زندگی بسر کرتی رہی۔ لیکن اس کے باوجود عروج و اقبال سے محروم ہو گئی تو پھر یہ سمجھنا درست ہو گا کہ ان قوانین میں اس کی صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ آگے چل سکتے۔ لیکن اگر واقعہ اس کے خلاف ہو، یعنی حقیقت یہ ہو کہ اس قوم نے ان قوانین کی پابندی چھوڑ دی تھی تو پھر یہ دیکھنا ہو گا کہ کیا ان قوانین میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے

تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ اور اگر ان پر آج بھی عمل پیرا ہوا جائے تو اس سے وہی نتائج مرتب ہو سکیں جو اس زمانے میں ہوئے تھے۔ آیئے! ان سوالات پر حقیقت پسندانہ انداز سے غور کریں، اور جذبات سے الگ ہٹ کر دیکھیں کہ تاریخی شواہد اور واقعاتِ عالم کا مطالعہ ہمیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔

(۰)

انہوں نے اِسلام کو چھوڑ دیا

پہلے ہم اس سوال کو لیتے ہیں کہ کیا اُس قوم نے اسلام کے اصولوں کا اتباع بدستور جاری رکھا تھا یا انہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس سلسلہ میں، میں اس مقام پر صرف چند ایک اصولوں کا ذکر کروں گا، اور وہ بھی اجمالاً۔ ان کا تفصیلی تذکرہ اگلے سوال کے جواب میں سامنے آئے گا۔

۱۔ ملوکیت

اسلام نے اصول یہ دیا تھا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے۔ حکومت کا فریضہ، قوانینِ خداوندی کا نافذ کرنا ہے جن کا اطلاق مملکت کے تمام افراد پر یکساں ہوگا۔ حتیٰ کہ ان سے سربراہِ مملکت بھی مستثنیٰ نہیں ہوگا۔ اُمت کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے اور معاشرہ میں عزت و تکریم کا معیار، جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار کی بلندی ہوگا، نہ کہ موروثی اور خاندانی وجاہت و ثروت۔ اس اصول نے ملوکیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افرادِ معاشرہ کو وہ حقیقی آزادی حاصل ہو گئی جس سے ان کی مضمر صلاحیتیں دنوں میں سرسبز و شاداب ہو کر نکھر اور اُبھر آئیں۔ اس قوم نے اپنی ہمعصر اقوام میں جو اس قدر بلند امتیازی مقام حاصل کر لیا تھا، اس کا بنیادی سبب یہی تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد، انہوں نے اسلام کے اس بنیادی اصول سے انحراف برت کر، اپنے ہاں ملوکیت کا نظام قائم کر لیا۔ اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو استبدادِ ملوکیت کے تحت ہوا کرتا ہے ——— یعنی شرفِ انسانیت کی تذلیل۔

۲۔ برہمنیت

اسلام نے یہ اصول دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب و دربان نہیں۔ ہر شخص بلا کسی درمیانی واسطہ کے، براہِ راست قوانینِ خداوندی کی اطاعت کر سکتا ہے۔ اس سے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور یوں اس استبداد کی زنجیریں کٹ گئیں جس نے انسانیت کے قلب اور دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس آزادی سے، انسانوں کو حریتِ فکر و نظر نصیب ہوئی اور وہ تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں جو علمی تحقیق اور فکری کاوش کے راستے میں بُری طرح حائل تھیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ قوم چند دنوں میں علم و بصیرت کی فضائے بسیط میں بے محابا پرواز کے قابل ہو گئی۔ اس کے بعد اس قوم نے اس اصول سے سرکشی برتی اور اپنے ہاں پھر سے برہمنیت کو رائج کر لیا۔ یہ وہ عذاب ہے جس میں یہ قوم اب تک ماخوذ چلی آ رہی ہے۔

۳۔ سرمایہ داری

اسلام نے یہ اصول دیا کہ یہ چیز وجہِ ذلّتِ انسانیت ہے کہ کوئی شخص روٹی کے لئے کسی دوسرے شخص کا محتاج ہو۔ نظامِ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری لے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہوگا کہ ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت کے بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں اور فاضلہ دولت کسی شخص کے پاس نہ رہے۔ اس سے جہاں تمام افرادِ قوم رزق کی پریشانیوں سے محفوظ ہو گئے، وہاں معاشرہ ہوسِ زر اندوزی کی لعنت سے بھی پاک ہو گیا۔ اس قسم کے نظام میں عروج و ارتقاء کی راہیں جس برق رفتاری سے کشادہ ہو جاتی ہیں، اس کی شہادت تاریخ کے اوراق سے مل سکتی ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد، جب اس قوم نے ملوکیت کو اپنے ہاں مچھر سے رائج کر لیا، تو نظامِ سرمایہ داری کی لعنت بھی ساتھ ہی آ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری ایک ہی شجرۃ الزقوم کے برگ و بار ہیں۔ جب یہ قوم اسلامی اصولوں پر کاربند تھی تو حالت یہ تھی کہ بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی سلطنت کے سربراہ (عمر فاروق رضؓ) کے تہبند پر دس دس بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے تھے۔ لیکن جب ان میں ملوکیت بار پا گئی تو کیفیت یہ تھی اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک جب (سیر و تفریح کے لئے نہیں) حج کے لئے چلا ہے تو چھ سو اونٹوں پر صرف اس کے کپڑے لدے ہوئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہوگی کہ اس قوم نے اسلامی اصولوں کو چھوڑ دیا تھا، یا باقی رکھا تھا۔!

۴۔ تکریمِ انسانیت

اسلام نے یہ اصول دیا تھا کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان، صرف انسان ہونے کی جہت سے، یکساں واجب التکریم ہیں۔ اس ایک اصول نے نسلی اور خاندانی تفاوت و امتیازات کی ساری عمارت منہدم کر کے رکھ دی، اور وہ خطۂ ارض، مساواتِ انسانیہ کے نور سے جگمگا اُٹھا۔ اس معاشرہ میں حبشی کا ایک غلام (بلال رضؓ) سردارانِ قریش سے زیادہ واجب التعظیم قرار پا گیا کہ سیرت و کردار کی رو سے وہ اُن سے ممتاز تھا۔ اور امیر المؤمنین (حضرت عمر رضؓ) کے جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے روم کے ایک مزدور (صہیب رضؓ) کو منتخب کیا گیا۔ نسلی امتیازات اور گروہ بندانہ تفریقات کے مٹنے کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ اُمت میں وحدت پیدا ہو گئی۔ یہ وہی چٹان تھی جس سے ٹکرا کر مخالفت کی ہر قوت پاش پاش ہو جاتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے پھر نسلی امتیازات کو بیدار کر لیا جس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ اُمت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ خلافت راشدہ تک تو سلطنت اُمتِ مسلمہ کی تھی۔ لیکن اس کے بعد مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ اُمت کی حکومت کہیں قائم نہیں ہوئی۔ یہ حکومتیں بنو اُمیہ۔ بنو عباس۔ بنو فاطمہ کی تھیں۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

۵۔ غلامی

تکریمِ انسانیت کا فطری نتیجہ غلامی کا ختم کر دینا ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت جو غلام اور لونڈیاں عرب معاشرہ میں موجود تھے، قرآن نے انہیں رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنا دیا۔ اور آئندہ کے لئے اس لعنت کو ختم کر دیا۔ معاشرہ میں جذب کردہ غلاموں کو مقام کیا دیا گیا تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ جب حضرت عمر رضؓ سے ان کی شہادت کے وقت کہا گیا کہ اپنے جانشین

کے بارے میں آپ اپنی رائے دے دیں تو آپ نے کہا کہ اگر ابی حذیفہؓ کا آزاد کردہ غلام، سالمؓ موجود ہوتا تو میں خلافت کے لئے اس کا نام تجویز کرتا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد، اس قوم نے شرفِ انسانیت کے اس اصول کو ترک کر دیا اور اپنے ہاں غلامی کو پھر رائج کر لیا۔ نتیجہ یہ کہ خلیفہ کے حرم میں ہزاروں کی تعداد میں لونڈیاں ہوتی تھیں اور بغداد میں ان کی خرید و فروخت کے لئے ایک بازار مخصوص تھا۔ جہاں حکومت کی زیرِ نگرانی انسانیت بکتی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بتانے کے لئے کہ اس قوم نے اسلام کے اصولوں کو چھوڑ کر پھر سابقہ روش اختیار کر لی تھی۔ اتنی مثالیں ہی کافی ہوں گی۔ بنا بریں، آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام نے کچھ وقت کے لئے تو خوشگوار نتائج مرتب کئے تھے لیکن اس کے بعد اس میں ایسا کرنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔

(۰)

کیا اسلام میں اب بھی اس کی صلاحیت ہے؟

اس کے بعد عزیزانِ من! ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ کیا اسلام میں اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت ہے؟ اور اس سوال کے جواب میں، میں یہ کہوں گا کہ "اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت" تو ایک طرف، اس چودہ سو سال میں دنیا میں چلا ہی اسلام ہے۔ کوئی دوسرا نظام چلنے کے قابل ثابت ہی نہیں ہوا۔ میرا یہ جواب بڑا تعجب انگیز نظر آئے گا۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے، محض جذباتی نعرہ نہیں۔ اس کے لئے پہلے ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ جو ابدی اصول اور مستقل اقدار، انسانی راہ نمائی کے لئے منجانب اللہ عطا ہوئے ہیں، ان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ، راستے کے موانعات کو ہٹاتے ہوئے، آگے بڑھیں اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ سورۂ فاطر میں ہے۔ اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ۔ (۳۵/۱۰) ان نظریاتِ حیات میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اوپر کو ابھرتے ہوئے، عروج و ارتقاء کی اس منزل تک پہنچ جائیں جسے ان کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ ان نظریات کو قرآن نے الحق کہہ کر پکارا ہے اور ان موانعات کو جو ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ باطل سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اسی کشمکش حق و باطل کے متعلق کہتا ہے کہ: بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ۔ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔ (۲۱/۱۸) الحق، باطل پر اپنا نشانہ لگاتا رہتا ہے۔ تا آنکہ باطل کا بھیجا نکل جاتا ہے۔ اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کہتا ہے کہ اس طرح باطل کی شکست اور حق کی فتح ——— یا یوں کہیئے کہ ان نظریاتِ حیات کے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔

کائناتی رفتار

یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔ (۳۲/۵) ان کی اس رفتار کا ایک ایک دن، تمہارے حساب و شمار کی رُو سے ایک ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔

اسے آپ انسانی تاریخ کی رفتار کہہ لیجئے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ انسانوں کی کوئی جماعت ان نظریات کو اپنی زندگی میں عملاً رائج کر لے، تو پھر ان کے نتائج، انسانی حساب و شمار کے مطابق دنوں میں مرتب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جہاں اس نے کہا ہے کہ: اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ۔ (ان نظریات میں از خود اُبھرنے کی صلاحیت موجود ہے) اس کے بعد کہا ہے کہ: وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ۔ (۳۵/۱۰) انسانی اعمالِ صالح کی قوت انہیں نہایت تیزی سے اوپر اٹھا دیتی ہے۔ یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

عقل کا تجرباتی طریق

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان اپنی عقل و فکر اور تجربہ و مشاہدہ کی رُو سے، مسائلِ حیات کے حل کرنے کی کوشش میں لگا چلا آ رہا ہے۔ غاروں کے زمانے سے لے کر اس دورِ تہذیب و تمدن تک کی تاریخ اس کی انہی کوششوں کی مسلسل داستان ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ وہ (TRIAL & ERROR) کے طریق سے معاملات کو سمجھتی اور سلجھاتی ہے۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے۔ اس پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ سینکڑوں برس کی لامتناہی خارہ شگافیوں کے بعد، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر پھر کوئی اور نظریہ وضع کرتی ہے اور اسی طریق پر، اس کا تجربہ کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح صدیوں کے پیہم ناکام تجارب کے بعد وہ کسی صحیح نظریہ تک پہنچتی ہے۔ عقل کے اس تجرباتی طریق کی رو سے، ایک صحیح نظریہ تک پہنچنے کے لئے، جہاں انسان کو ہزاروں سال کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے وہاں آگ اور خون کی سینکڑوں خندقیں بھی پھاندنی پڑتی ہیں۔ اس کے برعکس وحیٔ خداوندی انسان کو پہلے دن ہی صحیح نظریاتِ حیات عطا کر دیتی ہے۔ ان نظریات کی صداقت کو (علیٰ وجہ البصیرت) تسلیم کر کے، ان کے مطابق عمل پیرا ہو جانے والی جماعت، ان راستوں کو، جنہیں تنہا عقلِ انسانی نے قرن ہا قرن میں طے کیا تھا، اور وہ بھی اس قدر جانکاہ مشقتوں کے بعد، چند دنوں میں، نہایت امن و سکون کے ساتھ، طے کر جاتی ہے۔ اس طرح ان نظریات کے وہ نتائج، جو عقل کے تجرباتی طریق کی رو سے ہزارہا سال میں جا کر برآمد ہونے تھے، چند دنوں میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی علم و عقل بھی، رفتہ رفتہ، اُن صحیح نظریات تک پہنچ جاتی ہے، جنہیں وحی نے عطا کیا تھا۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ عقل کی راہیں بڑی طول طویل اور پُر از خطرات و صعوبات ہوتی ہیں اور وحی کی روشنی میں یہ راستہ طرفۃ العین میں طے ہو جاتا ہے اور نہایت امن و سلامتی کے ساتھ۔۔۔ افلاطون (PLATO) نے ہزاروں سال پہلے اس حقیقت کو پا لیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ:

یہ (اربابِ فکر) کچھ بنائیں گے۔ اسے پھر مٹائیں گے۔ یہی کچھ کرتے رہیں گے۔ تاآنکہ وہ انسانی راستوں کو حتی الامکان، خدائی راستوں سے ہم آہنگ کر لیں گے۔ (REPUBLIC)

اقبالؒ نے اسی حقیقت کو اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ:

ہر دو امیرِ کارواں، ہر دو بمنزلے رواں!
عقل بہ حیلہ می بُرد، عشق برد کشاں کشاں

(۰)

صدرِ اوّل میں اسلام

اس تمہیدی وضاحت کے بعد، اصل موضوع کی طرف آئیے۔ انسان، تنہا عقل کی رو سے، زندگی کے طول طویل راستوں پر گامزن چلا آرہا تھا ——— اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا، ٹھوکریں کھاتا، ٹھیاں تڑواتا ——— کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، قندیلِ وحی نے ان راستوں کو یک دم روشن کر دیا۔ عرب میں بسنے والی قوم نے اس کے عطا کردہ نظریاتِ حیات کو اپنایا اور برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد اس قوم نے وحی کی راہ نمائی کو چھوڑ دیا، اور کاروانِ انسانیت پھر عقل کے تجرباتی طریق سے شاہراہِ حیات پر گامزن ہو گیا۔ اب اس کی رفتار پھر سست ہو گئی۔ رفتار تو بے شک سست ہو گئی لیکن اس کا ہر قدم اٹھتا اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جس طرف اسے وحی کی روشنی لیے جا رہی تھی۔ چنانچہ تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان آج سے چودہ سو سال پہلے، جن غلط نظریات کو سینے لگائے ہوئے تھا اب رفتہ رفتہ انہیں چھوڑتا جا رہا ہے اور اُن نظریات کی طرف آرہا ہے جنہیں قرآن نے عطا کیا تھا۔ یہ ہے مطلب میرے اس کہنے کا کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، اسلام ہی آگے چلا ہے۔ اسلام کے خلاف نظریات سب ناکام ثابت ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آئیے، اس کی چند ایک مثالیں سامنے لائیں۔

———(٠)———

ا۔ حقِ حکومت

چھٹی صدی عیسوی میں، ساری دنیا میں اندازِ حکومت ملوکیت تھا جس کی رو سے، راجہ کو ایشور کا اوتار، قیصر کو خدائی اختیارات کا حامل، اور کسریٰ کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا۔ عین اس ماحول میں قرآن نے آکر کہا کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اُسے ضابطۂ قوانین، حقِ حکومت اور نبوت بھی کیوں نہ مل گئی ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اس ایک اصول کی رو سے قرآن نے، ملوکیت تو ایک طرف، حکومت کی کوئی ایسی شکل باقی نہ رہنے دی۔ جس میں انسان دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اب رہا یہ کہ پھر حکومت ہو کس طرح سے؟ اس نے کہا کہ حکومت انسانوں کی نہیں ہوگی۔ بلکہ ان مستقل اقدار اور اصولوں کی ہوگی جو خدا کی طرف سے عطا کئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے، امت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے اپنے معاملات طے کرے گی۔ (۴۲/۳۸) اس میں مذہبی پیشوائیت کا بھی کوئی دخل نہیں ہوگا اس لئے یہ نظام تھیاکریٹک بھی نہیں ہوگا۔ اس اصول کے مطابق مسلمانوں نے نظامِ حکومت قائم کیا جس کے انسانیت ساز نتائج وجہ اشادابیِ عالم بن گئے۔ اس کے بعد اس قوم نے اس اصول کو چھوڑ دیا، اور انسان پھر تنہا عقل کی رو سے، ایک اطمینان بخش نظامِ حکومت کی تلاش میں چل نکلا۔ اب آپ دیکھئے کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، انسان کا قدم ملوکیت کی طرف اٹھا ہے، یا یہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا، کسی ایسے نظام کی تلاش کرتا رہا ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ وہ اپنی اس تلاش میں ہزاروں خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کے بعد، اس نظام تک پہنچ پایا ہے جسے جمہوریت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملوکیت کے مقابلہ میں جمہوری نظام، اسلام سے زیادہ قریب ہے۔

مغرب کا جمہوری نظام

لیکن چونکہ یہ نظام مستقل اقدار کے تابع نہیں، اس لئے مکمل طور پر اسلامی نظام نہیں بن سکا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان اس نظام جمہوریت سے بھی مطمئن نہیں۔ خود مغرب کے بڑے بڑے مفکرین اور سیاست دان اس نظام کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ (مثلاً) فرانسیسی مفکر (RENE GUENN) لکھتا ہے:۔

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے۔ اور جو نہ پہلے کبھی وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی...... ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثر کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا۔

(CRISIS OF THE MODERN WORLD)

اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

"اکثریت کے فیصلوں" کے متعلق ایک اور مفکر، پروفیسر الفریڈ کوبن لکھتا ہے کہ:۔

(یہ اصول بنیادی طور پر غلط ہے) اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ نہ وہ کہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔

(THE CRISIS OF CIVILISATION)

پروفیسر کوبن نے کہا ہے کہ "فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو"۔ سوال یہ ہے کہ اس بات کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ فلاں فیصلہ درحقیقت صحیح ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ معیار، وہ مستقل اقدار ہیں جو وحی کی رُو سے عطا ہوتی ہیں۔ دیکھئے اس باب میں انگلی کا مشہور مدبر، میزینی کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے۔ اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت) یا زیادہ انسان (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں سے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ

رکھ سکے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو، اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے! خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں خواہ انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ کی حکومت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ یاد رکھیے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا حق ہی نہیں فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

(C.F. GRIFFIN - INTERPRETTERS OF MAN)

ہم سمجھتے ہیں کہ میزینی نے بات دوٹوک الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ عصرِ حاضر کی ساری کش مکش یہی ہے۔ میکیاولی اصولِ سیاست جسے سیکولر نظامِ حکومت کہا جاتا ہے، خواہ وہ مارکسی نظام ہو یا مغرب کا جمہوری نظام، کا ملخص یہ ہے کہ دنیا میں غیر متبدل اصول یا مستقل اقدار کوئی نہیں۔ انسان اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے میں اختیارِ مطلق رکھتا ہے۔ اس کے اس اختیار پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ اس کے برعکس، اسلام نے یہ کہا تھا کہ اگر انسان امن و سلامتی سے ترقی کی راہیں طے کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے فیصلوں کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار، مستقل اقدار کو قرار دے۔ میزینی نے یہی کہا ہے۔ دیکھئے کہ اس باب میں دیگر مفکرین کیا کہتے ہیں۔

پروفیسر (BREND) عصرِ حاضر کی بے لگام سیاست کے متعلق لکھتا ہے:-

انسانوں کی کوئی جماعت ہو، ایک فرد کو، ایک محدود حلقہ کے اندر اور خاص شرائط کے ماتحت ہی جذبات کی آزادی دی جاتی ہے۔ اگر وہ اپنے جذبات کو، اس محدود حلقہ سے باہر اور ان مخصوص شرائط کو توڑ کر بروئے کار لانے کی کوشش کرے تو وہ جماعت اس کی روک تھام کی تدبیر کرتی ہے۔ لیکن آج کوئی ایسا اقتدارِ اعلیٰ نہیں جو اقوام پر بھی اسی قسم کی پابندی عائد کر سکے۔ اس لئے اقوام کو اپنے جذبات کو بے لگام چھوڑنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ آج اقوامِ عالم کی حالت بالکل عہدِ طفولیت کی سی ہے جس میں بچہ ہر اس پابندی کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے جذبات کے راستے میں حائل ہو۔

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ :- (FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICT)

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو!
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہاں دیں سے مراد یہی مستقل اقدارِ خداوندی ہیں، نہ کہ مذہبی پیشوائیت کے وضع کردہ رسوم و عقائد۔

جس زمانے میں متحدہ اقوام کا "حقوقِ انسانیت کا منشور" زیرِ تدوین تھا، اس کے ادارہ (UNESCO) نے اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتب کر کے دنیا بھر کے مفکرین اور سیاستدانوں کے پاس بھیجا۔ اس ادارہ نے بعد میں، ان مشاہیر کے جوابات کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا تھا جس کا تعارف (JACQUES MARITAIN)

نے لکھا تھا۔ اس نے اس تعارف میں کہا تھا کہ:۔

انسانیت کے حقوق کی (DEFINITION) کی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے۔ حقوقِ انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عمل تصور مشترک ہو۔ اسی کو فلسفۂ زندگی کہا جاتا ہے

"فلسفۂ زندگی" مستقل اقدار کا دوسرا نام ہے۔ اسی کو اخلاقیات کہا جاتا ہے اور اخلاقیات کے متعلق راشڈل لکھتا ہے کہ:۔

ان سے مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔
(THE THEORY OF GOOD AND EVIL - VOL: II)

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ:۔

مستقل اقدار کے معنی یہ نہیں کہ ہر شخص خود فیصلہ کرے کہ مستقل قدر کیا ہے۔ مستقل اقدار کو عالمگیر ہونا چاہیئے جسے ہر شخص تسلیم کرے اور ان کا معترف ہو۔ (BETWEEN MAN AND MAN)

یہ اقدار ملتی کہاں سے ہیں، اس کے متعلق غور سے سنیئے، اور سننے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اس کا کہنے والا کوئی ملّا یا پادری نہیں۔ کہنے والا، عصرِ حاضر کا سب سے بڑا سائنٹسٹ آئن سٹائن ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جا سکتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیاد عقلِ انسانی پر نہیں ہوتی۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔ (OUT OF MY LATER DAYS)

جس نظام میں ان اقدار کو نظر انداز کر دیا جائے، اس کا حشر کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق، اس عالمگیر شہرت کے حامل دانشور کی زبان سے سنیئے جس کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ یعنی (THE MAKING OF HUMANITY) کا مصنف، برفاؤ۔ وہ لکھتا ہے:۔

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبّر اور دانش مندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری خارجی نظم و ضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی جب تک اس کی اصل باقی ہے، اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔

یہی مفکر آگے چل کر لکھتا ہے:۔

وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو، آخرالامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی شخص کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے، اس ناانصافی کی وجہ سے انجام کار تباہ ہو جاتی ہے۔

عدل کا مفہوم

برونر نے یہاں کسی نظام کی کامیابی کیلئے عدل کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ عدل کا عمومی مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ جو فیصلہ ملک کے مروجہ قانون کے مطابق ہو، وہ عدل کہلائے گا۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلے کو عدل کہا جائے گا۔ لیکن جس قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے اگر وہی عدل پر مبنی نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا۔ اس لئے اس نے کہا کہ ملک کے قوانین کو الحق کے مطابق ہونا چاہیئے یعنی مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق۔ (۷/۱۸۱) تاکہ جو فیصلے اس قانون کے مطابق کئے جائیں وہ فی الواقعہ مبنی بر عدل کہلا سکیں۔ دیکھئے اس باب میں، دورِ حاضر کا ایک مشہور فلسفہ قانون کا ماہر (EMIL BRUNNER) کیا کہتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER) میں لکھتا ہے:-

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے۔ ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی، اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔

(۰)

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ قرآن کریم نے اصول یہ دیا تھا کہ:-

۱۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ اس لئے ملوکیت، آمریت وغیرہ سب نظامِ حکومت باطل ہیں۔ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔

۲۔ لیکن اس مشاورت میں ایک شرط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا۔ اور وہ یہ کہ کوئی فیصلہ ان کے اقدار کے خلاف نہ ہو جو حقِ مطلق کی حیثیت رکھتی ہیں اور وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں۔

ایک قوم نے، آج سے چودہ سو برس پہلے اس اصول کو نظامِ حیات بنایا اور دنیا نے اس کے نتائج دیکھ لئے۔ اس کے بعد، اس قوم نے اس اصول کو ترک کر دیا اور باقی دنیا کے ساتھ انسانوں کے وضع کردہ نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے لگ گئی۔

۳۔ اس کے بعد، عقل کے تجرباتی طریق نے انسان کو اس طریق پہ پہنچایا کہ ملوکیت، آمریت وغیرہ نظام غلط ہیں۔ ان کے برعکس، نظامِ مشاورت صحیح نظام ہے جسے جمہوریت کہا جاتا ہے۔

میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اس حد تک، دنیا میں اسلام کا پیش کردہ اصول آگے چلا ہے یا وہ اصول جو پیچھے سے چلا آرہا تھا اور اسلام نے اسے باطل ٹھہرایا تھا۔

۴۔ لیکن ہمارے زمانہ تک عقلِ انسانی ہنوز اسلامی اصول کے ایک حصہ کو اپنا سکی ہے۔ یعنی ملوکیت کی جگہ مشاورتی نظام کو۔ اس اصول کے دوسرے حصہ، یعنی یہ کہ اس مشاورت کو مستقل اقدار کے تابع رہنا چاہیئے، تک ابھی نہیں پہنچ سکی۔ بایں ہمہ، اسلامی اصول کے اس حصہ کی صداقت اور اہمیت، دورِ حاضر کے مفکرین کی نگاہوں کے سامنے آ رہی ہے۔ اور وہ اس پر زور دے رہے ہیں کہ اسے بھی اپنایا جائے۔ وہ دن دور نہیں جب انسان اس اصول کو اپنانے پر بھی مجبور ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس نظامِ زندگی کے حیات سوز اور تباہ کن اثرات، جسے عصرِ حاضر نے مستقل اقدار کو نظر انداز کر کے تعمیر کیا، اس قدر نمایاں طور پر سامنے آ رہے ہیں کہ خود وہ قومیں جنہوں نے اس نظام کو متشکل کیا تھا، ان کی دہشت سامانیوں کو دیکھ کر چیخ اٹھی ہیں۔ اس چیخ و پکار کی تفصیل میں جانے کے لئے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہو گی۔ میں اس مقام پر دو ایک اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔ کچھ عرصہ پہلے، لارڈ اسنل (SNELL) نے (THE NEW WORLD) کے نام سے ایک اہم کتاب لکھی تھی۔ وہ اس میں کہتا ہے:۔

نوعِ انسان کی پوری تاریخ میں اس قسم کا دور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وقت تہذیب ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ اور یہاں سے اگر ایک قدم بھی غلط سمت کی طرف مڑ گیا تو وہ اسے برباد بلکہ فنا کر دے گا۔ یوں تو انسان کی طول طویل تاریخ میں بہت سے حوادث آئے ہیں لیکن موجودہ حادثہ نہ صرف ان سب وسعتوں اور پہنائیوں میں بڑا ہے بلکہ یہ ان سب سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے۔ پہلے حوادث خاص خاص خطوں میں رونما ہوا کرتے تھے اور متعین مسائل سے متعلق ہوتے تھے۔ جنگ ہوتی تھی تو کسی ایک مقصد کے لئے ـــــ کبھی خام پیداوار کے لئے، کبھی مال کی منڈیوں کی تلاش میں، کبھی دفاعی مقصد کی غرض سے ـــــ وہ لڑائیاں خاندانی وجاہت اور مادی تفوق کے لئے ہوتی تھیں۔ لیکن گذشتہ جنگ (یعنی دوسری جنگِ عظیم) کو دیکھئے۔ اس کی ظلمتِ انسانی قلب کی گہرائیوں میں دکھائی دے گی۔ نسلی افتخار، جذباتِ تغلب و تسلط۔ اور ملکت کے متعلق غلط فلسفہ۔

لہٰذا جو مصیبت ہمارے سامنے ہے اس کے متعلق ہمیں کبھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے پہلے منظم شر کی قوتیں کبھی اس قدر زور آور نہیں ہوئی تھیں۔ اب تو ان سے نجات کا راستہ ہی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر ملک ویرانہ بن رہا ہے اور اس ویرانے پر افلاس، امراض اور اموات کے شیاطین منڈلا رہے ہیں..... انسانیت اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں سے کچلی جا رہی ہے، تباہ ہو رہی ہے۔ یہ مصیبتیں نتیجہ ہیں ان میکانکی قوتوں کا جنہیں انسان نے ایجاد تو کر دیا۔ لیکن ان پر قابو پانا نہ سیکھا۔ ہر جگہ ریب و شکوک اور اخلاقی اقدار کی شکست کا اندوہناک احساس انسانی قلوب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ زندگی اس بیم و رجا، فتح و شکست، امید و یاس کے

---

* تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" جس سے یہ اقتباسات لئے گئے ہیں۔

دوراہے پر کھڑی ہے۔ اگر ہم نے اپنی ناتواں زندگیوں کی شکستہ عمارت کو از سرِ نو محکم بنیادوں پر استوار نہ کیا تو ہماری تقدیر بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔

حکیمِ مشرق نے اس سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ:-

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

یہ تو ہے عصرِ حاضر کی خاطر اقدار فراموش دنیا کی اجتماعی زندگی کا نقشہ۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے، علمِ تحلیلِ نفسی کے عظیم محقق ڈاکٹر ینگ نے آج سے بہت پہلے لکھا تھا کہ:-

عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں ان وحشیانہ قوتوں کے مقابلہ میں جن پر وہ اپنے دَور کی معاشی اور سیاسی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی دنیا کی حالت۔ اور اگر وہ اس اندھی دنیا سے، جہاں تعمیر و تخریب کی قوتیں ہر نزاع کے پلڑوں کو اٹھاتی جھکاتی رہتی ہیں، اپنے اندر کی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے بھی تازہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

(MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL)

عصرِ حاضر کے راہ گم کردہ انسان کی یہی وہ قلبی کیفیت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:-

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

میں پوچھنا چاہتا ہوں اسلام کو ناکام کہنے والوں سے کہ اقوامِ دورِ حاضر کی یہ چیخ و پکار اسلامی نظامِ زندگی کی طرف دعوت دے رہی ہے یا اس سے دُور بھاگنے کی تلقین کر رہی ہے؟

———(۰)———

نظریۂ قومیت

اب ایک اور سوال کو سامنے لائیے۔ انسان نے جب مل جُل کر رہنے کی زندگی شروع کی تو اسے لامحالہ کسی ایسی بنیاد کی تلاش ہوئی جس سے افراد مل کر ایک جتھہ بن سکیں۔ اُس دَور میں یہ بنیاد خون کے رشتوں کے سوا اور کوئی ہو سکتی تھی؟ ایسے ایک خاندان کے افراد ملکر ایک جتھہ بن گئے۔ انہی خاندانوں نے وسعت اختیار کر کے قبائل کی شکل اختیار کر لی۔ اور قبائل وسیع تر ہو کر نسلی امتیازات کے حلقے بن گئے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں یہی امتیازِ قومیت کا معیار تھا۔ اسلام نے یہ انقلابی آواز اٹھائی کہ قومیت کا یہ معیار غلط ہے۔ اس وقت بھی اس کے نتائج بڑے خطرناک مرتب ہو رہے ہیں لیکن جب انسانی آبادی اور بڑھی اور وسائلِ رسل و رسائل اور ذرائع مواصلات عام ہوئے تو قوموں کا باہمی تصادم خود نوعِ انسانی کو تباہ کر دے گا۔ اس نے کہا کہ قومیت کا معیار خون، رنگ، نسل، زبان کے اشتراک کے بجائے، فکر و نظر کی ہم آہنگی ہونا چاہیئے۔ اسی کو آئیڈیالوجی یا ایمان کا اشتراک کہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ اس اشتراک کو کسی خاص خطۂ زمین تک محدود نہیں ہونا چاہیئے۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً۔ (۲/۲۱۳) اسے تمام نوعِ انسان کو محیط ہونا چاہیئے۔ بالفاظِ دیگر اس نے کہا کہ رنگ، نسل، زبان یا وطن کے اشتراک کی بنا پر مختلف قومیں تشکیل کرنے کے بجائے نظریاتِ زندگی کے اشتراک کی بنا پر عالمگیر انسانیت کی برادری کی تشکیل کرنی چاہیئے۔ اس بنیاد پر اس نے ایک امت کی تشکیل کی جس نے زندگی کے غلط نظاموں کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد اس اُمت نے بھی اس اصول کو فراموش کر دیا اور پھر انہی قدیم معیاروں کے مطابق ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس کے بعد دنیا، عقل کے تجرباتی طریق کی رُو سے، اسلام کے پیش کردہ اصولِ اجتماعیت کی طرف آ رہی ہے یا اس کے خلاف جا رہی ہے۔ پیدائش کے لحاظ سے انسانی تفریق کی بدترین شکل ہندوستان میں رائج تھی جہاں بھارت سے باہر کے انسانوں کو انسان نہیں بلکہ ملیچھ (ناپاک حیوان) سمجھا جاتا تھا اور بھارت کے اندر بسنے والے انسانوں کو چار ورنوں (ذاتوں) ـــــ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر ـــــ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ یہ تقسیم امٹ تھی۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ برہما کی بنائی ہوئی ہے اور اس لئے ان کے دھرم کا بنیادی حصہ ہے۔ آج وہاں یہ ساری تقسیم آئینی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ انسانی معاشرہ کی یہ تبدیلی قرآن کے دیئے ہوئے اصولوں کی کامیابی کا ثبوت ہے یا اس کی ناکامی کی دلیل! اس سے بھی آگے بڑھئے۔ اس سے پہلے دنیا کی ساری آبادی مختلف نسلوں میں بٹی ہوئی تھی ـــــ اصولی طور پر، سیاہ، سفید، سرخ اور زرد نسلوں میں۔ اور فروعی طور پر ہر نسل کے اندر سینکڑوں شاخوں میں۔ عصرِ حاضر کی سائنٹیفک تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نسلوں کی یہ تفریق یکسر غیر فطری ہے۔ کسی نسل کو دوسری نسل پر کوئی تفوق حاصل نہیں۔ اور عملاً ان نسلوں کا امتیاز مٹتا چلا جا رہا ہے۔ کہئے کہ دنیا اسلام کے قریب آ رہی ہے یا اس سے دور چلی جا رہی ہے؟

لیکن عقلِ انسانی کا تجرباتی عمل ابھی یہیں تک پہنچ سکا ہے۔ اس نے ہنوز انسان کو وطن کی تنگ نائے سے باہر نہیں نکالا۔ یعنی اب انسانوں کی تفریق اور قوموں کی تقسیم، وطن کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے۔ اس نظریہ کو نیشنلزم کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان اپنے وضع کردہ اس نظریہ کے نتائج سے مطمئن ہے یا اس کے ہاتھوں نالاں ہے۔ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں، خود اس نظریہ پر عمل پیرا اقوامِ مغرب کی زبانی سنیئے ـــــ پروفیسر الفریڈ کوبن، جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، اس باب میں لکھتا ہے:-

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان قوموں کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا، جونہی کوئی قوم اپنے حقِ استقلال و خود مختاری کو مسلط کر لیتی ہے تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے خود مختاری کی مدعی ہوں۔ ان وجوہات کی بنا پر لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظامِ حکومت کے لئے نیشنلزم کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔

پروفیسر میسن اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے کہ:-

> جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے۔ جس طرح افراد میں باہمی تنازع کی بنیاد جذبۂ انانیت ہوتا ہے۔ اور تنازعِ جنگ

کی ساری تاریخ کا سراغ اس بنیاد سے لگ سکتا ہے۔

پروفیسر ولیم برنڈٹ نے، دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ پر لکھا تھا کہ:۔

اغلب یہی ہے کہ موجودہ جنگ کے بعد اقوامِ یورپ چند سال تک عملی نبرد آزمائی میں نہیں اُلجھیں گی، کیونکہ ان میں سے بعض تو بہت تھکی ہوئی ہوں گی اور بعض کو ان کے فاتحین دبا کر رکھیں گے۔ لیکن نیشنلزم کا وہ جذبہ جو جنگ کا اصلی ذمہ دار ہے، باقی رہے گا۔ اس لئے مستقبل میں جنگ کو ختم کرنے کے لئے آج کی سیاست دانی کی پرکھ اسی سے ہوگی کہ موجودہ جنگ کے بعد نیشنلزم کے اس جذبہ کے متعلق کیا تدبیر اختیار کی جاتی ہے۔

(FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICT)

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (THE HOPES FOR A CHANGING WORLD) میں لکھتا ہے:۔

ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوعِ انسان کی تباہی کیلئے سب سے بڑی قوت ہے۔ (پھر تماشہ یہ کہ) ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم اچھی چیز ہے۔

بڑی مصیبت یہ ہے کہ یورپ نے نیشنلزم کو محض ایک سیاسی مسلک کی حیثیت سے ہی اختیار نہیں کیا بلکہ اسے مذہب کی پوزیشن دے رکھی ہے۔ وہاں وطن کو ایک دیوتا سمجھا جاتا ہے جس کی پرستش ہوتی ہے۔ آلڈس ہکسلے اس بات میں بڑی وضاحت سے لکھتا ہے اور بہ تکرار و اصرار لکھتا ہے کہ:۔

نیشنلزم ایک بت پرستانہ، مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ وہ مذہب جو فساد و تفریقِ انسانیت کے لئے اب اتنا طاقتور ہے کہ کوئی خدا پرست مذہب، فلاح اور وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔

دوسرے مقام پر لکھتا ہے:۔

نیشنلزم، جسے ہم نے ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے، کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے۔ یہ ان میں سے ہر قوم کا "مملکتی مذہب" ہے۔ یعنی خدا کے بجائے قوم کی پرستش جسے اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا، ان پچاس دیوتاؤں میں سے، ہر ایک دیوتا کا پجاری باقی انچاس پجاریوں کو میکیاولی تصور کرتا ہے۔ نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رو سے، عالمگیر انسانیت، خدائے واحد اور احترامِ آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پا جاتے ہیں اور ان کے بجائے علیحدگی، انانیت، خود اکتفائیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں اس کا وجوب ہوتا ہے۔ یاد رکھیئے! ہر نیشنلزم ایک بت پرستانہ مذہب ہے۔[1]

---

[1] حوالوں کے لئے دیکھئے میری کتاب ــ انسان نے کیا سوچا؟ ــــ (صفحہ ۲۴۱-۲۴۰)

ضمناً، ہکسلے نے نیشنلزم کو آج ایک "باطل خدا" کہا ہے۔ اقبالؒ نے آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کہا تھا کہ:۔

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے!
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور اس کا نتیجہ یہ بتایا تھا کہ:۔

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اور اس کے بعد مسلمانوں سے تاکید کی تھی کہ: ع

اے مصطفویؐ! خاک میں اس بت کو ملا دے

بہرحال، میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس نیشنلزم کے ہاتھوں، جسے اسلام نے فسادِ آدمیت کی بنیاد قرار دیا تھا، خود اقوامِ مغرب کے مفکر اور سیاست دان اس قدر گریاں و نالاں ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں "اسلام کو چلا ہوا کارتوس" کہنے والوں سے کہ اقوامِ یورپ کا یہ واویلا، اسلامی اصولِ قومیت کی صداقت کی شہادت ہے یا اس کے ناکارہ ہونے کی دلیل!

یہ اس مسئلہ کا منفیانہ پہلو تھا۔ یعنی نیشنلزم کی تباہ کاریوں کے خلاف اقوامِ مغرب کا نالہ و شیون۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں اس فساد کا علاج کیا ہے؟ پروفیسر آرنلڈ نے کہا تھا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم قومیت کی جگہ بین الاقوامیت (انٹرنیشنلزم) کو فروغ دیں۔ اس کے خلاف مسٹر (EMERY - REVES) نے کہا کہ:۔

ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ (اقوامِ متحدہ کی ناکامی اس کا بین ثبوت ہے) جو مسئلہ دنیا کے سامنے ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں فساد برپا کر رکھا ہے۔ لہٰذا، کیسے ممکن ہے کہ نیشنلزم خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے اس کا حل دریافت کر دے۔ اس کا حل انسانی عالمگیریت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جا کر، خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔

(THE ANATOMY OF PEACE)

کیتھولک چرچ کا راندۂ درگاہ پادری (TEILARD- DE - CHARDIN) جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب (BUILDING OF THE EARTH)

میں لکھتا ہے:-

اب اقوام کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کر دیں اور مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (HUGH MILLER) اپنی کتاب میں، جس کا نام ہی اس نے (THE COMMUNITY OF MAN) رکھا ہے، لکھتا ہے:-

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداء میں موجود تھی۔ لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندان، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہم گرجوڑ دے۔ انسانی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔

جی نہیں چاہتا کہ میں یہ کہے بغیر آگے بڑھ جاؤں کہ جو کچھ اس مفکر نے کہا ہے وہ گویا قرآنی آیات کا ترجمہ ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا۔ (۱۰/۱۹) نوعِ انسان، شروع میں ایک ہی برادری تھی۔ لیکن اس کے بعد اس نے باہمی اختلاف پیدا کر لیا اور مختلف خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ اس میں پھر سے وحدت پیدا کرنے کے لئے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملی۔ (۲/۲۱۳) اس نے کہا ہے کہ انسانیت کی بارگاہ میں سب سے بڑے مجرم وہ ہیں جو يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ۔ (۲/۲۷) جس بکھری ہوئی انسانیت کو جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں اور اس طرح دنیا میں فساد برپا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

عزیزانِ من! آپ قرآنِ کریم کی ان آیاتِ جلیلہ پر غور کیجئے اور پھر پروفیسر ملر کے مذکورہ بالا اقتباس کو دیکھئے۔ اور پھر بتایئے کہ کیا وہ انہی آیات کا ترجمہ نہیں؟ آپ دیکھتے ہیں کہ اپنے غلط نظریات کا ستایا ہوا انسان آخر الامر کس آستانہ پر پہنچ کر پکارتا ہے کہ:-

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

انسان، جس عالمگیر انسانی برادری کی تلاش میں ہے، اس کی تشکیل کا طریق کیا ہوگا، اس کے متعلق سویڈن کا مشہور ماہرِ اقتصادیات (GUNNER MYRDAL) لکھتا ہے:-

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں۔ اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط

پر اپنے لئے حصولِ مسرت حاصل کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔

اور اس کے بعد یہ مفکر لکھتا ہے کہ:۔

ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی ہی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل آہنگی اور یک جہتی ہو۔ (BEYOND THE WELFARE STATE)

اس مذہب کے متعلق، جو (MYRDAL) کی روح کے نشیمن میں جلوہ بار ہے، ایک ممتاز ماہر نفسیات (ERIC FROMM) لکھتا ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہوگی جو:

انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا، اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دیگا۔ جو مشرق و مغرب کی تمام تعلیم کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جو علومِ سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔

(THE SANE SOCIETY)

وقت نہیں، ورنہ میں، عزیزانِ گرامی قدر بتاتا کہ قرآن کریم کس طرح اُس دین کی یہی خصوصیات بتاتا ہے جسے اس نے عالمگیر انسانیت کے لئے بطور ضابطۂ حیات تجویز کیا ہے۔ اس مفکر نے کہا ہے کہ زمانے کے تقاضوں کی رو سے اس مذہب کی نمود ہوگی۔ اور قرآن کریم نے بھی طرح اپنے مستور حقائق کی نمود کے لئے بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱/۵۳)

(جوں جوں علم انسانی ترقی کرے گا اور انسانی تقاضے بڑھیں گے) عالم الفنس و آفاق کے مستور حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ اور جوں جوں یہ حقائق بے نقاب ہوں گے۔ یہ حقیقت سامنے آتی جائے گی کہ جو کچھ قرآن نے کہا تھا وہ صداقت پر مبنی تھا۔

(۰)

یہ مذہب اسلام ہی ہو سکتا ہے

اب رہا یہ سوال کہ دنیا کو جس عالمگیر مذہبِ انسانیت کی تلاش ہے کیا وہ اسلام کے سوا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں، ایک غیر مسلم کی زبان سے سنیئے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ غیر مسلم کون ہے اور کس پایہ کا مفکر ہے۔ یہ عصرِ حاضر کا سب سے بڑا مؤرخ، پروفیسر آرنلڈ ٹوئن بی ہے۔ وہ اپنی کتاب (THE WORLD AND THE WEST) میں لکھتا ہے ——— اور دیکھئے کہ وہ ایسا لکھتے وقت ہمارے منہ پر کتنے زور سے طمانچہ مارتا ہے ———

وہ کہتا ہے:-

مغرب میں بعض دوسرے تصورات بھی ہیں جن کا باعثِ فوز و فلاح ہونا بے حد مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے۔ ترک اور بعض دیگر اسلامی ممالک نیشنلزم کے تصور سے بھی اسی طرح متاثر ہوتے جا رہے ہیں جس طرح اور مغربی تصورات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ جن مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان بلا لحاظ اختلافِ نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں، ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہو گیا تو دنیا کا حشر کیا ہو گا؟ آج جبکہ مغربی صنعت کاری کی وجہ سے دنیا میں "فاصلہ" کا تصور آہستہ آہستہ مٹتا جا رہا ہے، مسلمانوں کا اخوتِ باہمی کا عقیدہ یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے عقیدہ سے کہیں بہتر ہے اور یہی عقیدہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے، برعکس مغربی عقیدہ کے جس نے یورپ میں، محض قومیت کے معیار پر، درجنوں آزاد مملکتوں کو پیدا کر رکھا ہے جن میں سے ہر ایک دوسری سے الگ ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہو چکی ہے، اس میں یورپ کے اندر کم و بیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج ہی نہیں ہو سکتا۔ (خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن) یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا کہ وہ اس کے تصوراتِ حیات کو آنکھیں بند کئے اپناتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے عالمگیر مؤدت و اخوت کے تصور کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصور اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصور، ویسے تو انسانی فلاح کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے، لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔

پروفیسر ٹوئن بی کے نزدیک، دنیا میں عالمگیر برادری متشکل کرنے کا واحد ذریعہ اسلامی نظریۂ اجتماعیت ہے۔ اور اسے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اگر یہ نظریہ بھی باقی نہ رہا تو دنیا کا کیا حشر ہو گا! میں پوچھنا چاہتا ہوں اپنے ہاں کی فریب خوردہ ذہنیتوں سے کہ کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے، یا دنیا اسے اپنی نجات کے لئے آخری سہارا قرار دے رہی ہے! اور پھر میں پوچھنا چاہتا ہوں قومیت زدہ مسلمانوں سے کہ وہ سوچیں کہ دنیا ان کے ساتھ کیا توقعات وابستہ کئے ہوئے ہے، اور وہ کس طرف جا رہے ہیں؟ غالب نے کسی ایسے ہی حسرت آمیز منظر سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ:-

تماشہ کر اے محوِ آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

(۰)

نظامِ سرمایہ داری

اب میں، عزیزانِ من! انسانی زندگی کے ایک اور اہم گوشے کی طرف آنا چاہتا ہوں۔ یہ وہ گوشہ ہے جس نے عصرِ حاضر میں خاص طور پر بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی

معاشی نظام کا مسئلہ۔ انسانی زندگی کا مدار، زمین کی پیداوار پر ہے۔ جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی اس نے دیکھا کہ اس ذریعۂ زیست پر بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا قبضہ چلا آرہا ہے اور وہ اپنی مقبوضہ زمین پر مزارعوں ہی سے نہیں، غلاموں سے کام کراتے ہیں۔ قرآن نے آکر یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ نہ ذرائع پیداوار پر افراد کی ملکیت ہو سکتی ہے، نہ کسی انسان کے پاس اُس کی ضروریات سے زائد (فاضلہ) دولت رہ سکتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو غلامی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور دوسری طرف نظامِ سرمایہ داری کی بساط اُلٹ گئی۔ اور قرآن کی حامل قوم نے ایسا معاشرہ متشکل کر کے دکھا دیا جس میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم تھا اور نہ ہی کوئی تن آسان دولت پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا۔ اس طرح دنیا کو بتا دیا گیا کہ یہ نظام ممکن العمل بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی ـــــ مسلمانوں نے کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کو ختم کر دیا اور قرآنی اصول پھر اپنی کائناتی رفتار سے آگے بڑھنے لگے۔

آپ سوچئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، انسان کے قدم نظامِ سرمایہ داری کی طرف اُٹھے ہیں یا اُس نظامِ معیشت کی طرف، جسے قرآن نے وجہِ احسنِ انسانیت قرار دیا تھا! آج اس باب میں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ آج اِس نظام کا غلغلہ ساری دنیا میں بلند ہو رہا ہے۔ کیا یہ اس امر کی زندہ شہادت نہیں کہ اسلامی نظامِ معیشت ہی آگے چلا ہے اور اسی میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ عالمگیر انسانیت کے لئے حیات بخش نظام بن سکے۔ لیکن عقل کا تجرباتی طریق ابھی اس نظام کے مادی پیکر تک پہنچ سکا ہے۔ اس کی روح تک ہنوز اس کی رسائی نہیں ہوئی۔ وہ اس کی بالائی عمارت کو چھو سکا ہے۔ اس کی بنیادوں کو ابھی نہیں پا سکا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ نظام، اول تو اپنی پہلی منزل ـــــ یعنی سوشلزم ـــــ میں ٹھٹھر کر رہ گیا ہے۔ آخری منزل ـــــ کمیونزم ـــــ تک پہنچ ہی نہیں پایا۔ اور دوسرے، سوشلزم، بھی ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں کے جھکڑوں کے زور سے فضائے عالم پر چھا جانے کی کوشش میں مصروف ہے قلب و دماغ کے اطمینان سے زندگی کی بنیاد نہیں بن رہا۔ یہ اس لئے کہ اس قسم کے معاشی نظام کی بنیاد جس تصورِ حیات پر استوار ہو سکتی ہے وہ اس کی نگاہوں سے ہنوز اوجھل ہے۔ وہ بنیاد ہے مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخرت پر ایمان ـــــ وہ ایمان، جس کی بنا پر اس ذمہ داری کو قبول کرنے والے (عمر فاروقؓ) نے کہا تھا کہ:۔

اگر (انسان تو ایک طرف) دجلہ کے کنارے سے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم، عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی۔

"باز پرس" کا اس قسم کا احساس، صرف حیاتِ آخرت کے ایمان سے پیدا ہوتا ہے، اور جب تک یہ احساس بیدار نہ ہو، یہ معاشی نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ گوئٹے نے کس قدر بلیغ انداز میں کہا ہے کہ تسلسلِ حیات کے بغیر تو اس دنیا کی زندگی بھی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ میں کیوں نہ اس کے اپنے الفاظ (QUOTE) کر دوں۔ اس نے کہا ہے کہ:۔

THAT MAN IS DEAD EVEN IN THIS LIFE —
WHO HAS NO BELIEF IN ANOTHER[1]

[1] QUOTED BY DIXON, IN, THE NUMAN SITUATION (P. 428)

سوشلزم، عقل کے تجرباتی طریق کا قدمِ اوّل ہے۔ اس کے عملی نفاذ کے بعد جب اس تجربہ میں مزید اضافہ ہوگا تو وہ اس بنیاد تک بھی پہنچ جائے گی جس کے بغیر یہ عمارت استوار نہیں ہو سکتی۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر روس کے متعلق کہا تھا کہ:-

فکرِ اُو در تند بادِ لا بماند
مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند!
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تند باد آید بروں

اس لئے کہ:-

درمقامِ لا نیا ساید حیات سوئے اِلّا می خرامد کائنات

(۰)

بنیادی حقوقِ انسانیت

ہمارے زمانے میں بنیادی حقوقِ انسانیت (FUNDAMENTAL HUMAN RIGHTS) کا بڑا چرچا ہے اور اقوامِ متحدہ (U.N) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ان حقوق کو متعین کر کے ان کا چارٹر شائع کر دیا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بنیادی حقوق کا تصور سب سے پہلے قرآنِ کریم نے دیا تھا اور انہیں نہایت وضاحت سے بیان بھی کر دیا تھا۔ قلتِ وقت کی بنا پر، میں ان حقوق کی تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ اس لئے اجمالاً چند ایک کے تذکرہ پر اکتفا کروں گا۔ دیکھئے، قرآنِ کریم کی رُو سے وہ حقوق کیا ہیں:-

(۱) تکریمِ آدمیت۔ یعنی ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں تکریم کا مستحق ہے۔
(۲) جنسی مساوات۔ زندگی کے کسی شعبہ میں مرد اور عورت میں کوئی تفاوت نہیں۔
(۳) مدارج کا تعین افراد کے جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار کی رُو سے کیا جائے گا۔
(۴) اطاعت صرف قانون کی ہوگی۔ اشخاص کی نہیں۔
(۵) ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا حق ادا کیا جائے گا۔ اسے عدل کہا جاتا ہے، اور جس شخص میں کوئی کمی ہوگی اس کی کمی پوری کی جائے گی۔ اسے احسان کہا جاتا ہے۔
(۶) ہر شخص کو رزق (سامانِ زیست) مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔
(۷) جان کی حفاظت کا حق۔
(۸) جو چیز قانوناً کسی کی ملکیت میں دی جائے اس کی حفاظت کا حق۔
(۹) سکونت کا حق۔ (۱۰) عصمت کی حفاظت کا حق۔
(۱۱) شادی میں انتخاب کا حق۔ (۱۲) حسنِ ذوق (AESTHETIC TASTE) کا حق۔

(۱۳) مذہبی آزادی کا حق۔ (۱۴) سچی بات کہنے کا حق۔
(۱۵) مظلوم کو فریاد کا حق۔ (۱۶) پرائیویسی کا حق۔
(۱۷) حیثیتِ عرفی کے تحفظ کا حق۔
(۱۸) اثباتِ جرم کے بغیر، ہر ایک کو بے گناہ تصوّر کئے جانے کا حق۔[۱]

یہ اور اسی قسم کے دیگر حقوق کا تعین قرآنِ کریم نے اس زمانے میں کیا جب دنیا میں افراد کے حق کا تصور بھی کہیں نہیں تھا۔ آپ غور کیجئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، انسانی فکر نے ان حقوق کا تقاضا کیا ہے یا اس نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے! اور اگر اس نے ان حقوق کا مطالبہ کیا ہے تو کیا یہ اسلام کی کامیابی کی دلیل ہے یا اس کی ناکامی کا ثبوت؟ اسلام کی ناکامی تو ایک طرف، فکرِ انسانی اس باب میں بھی ہنوز اسلام سے پیچھے ہے۔ اسلام نے ان حقوق کو ابدی اور غیر متبدل قرار دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کا کوئی نظام ان میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس، اقوامِ متحدہ کے متعین کردہ حقوق کی کیفیت کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ (اس نے ان حقوق کے تعین کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن نے دنیا بھر کے دانشوروں سے مشورہ کے بعد جو رپورٹ شائع کی تھی اس میں لکھا تھا:۔)

> یہ حقیقت بدیہی ہے کہ یہ تمام حقوق بالآخر انسانی حقوق ہیں اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عاید کی جائیں اور انہیں قابلِ ترمیم و تبدل قرار دیا جائے۔ حتیٰ کہ جن حقوق کو غیر مشروط کہا جاتا ہے، ان میں بھی، ان حقوق کا مالک ہونے اور ان کے استعمال کا حق رکھنے میں بنیادی فرق ہے۔ ملکیت بجا ہے لیکن ان کا استعمال ان حدود اور پابندیوں کے مطابق ہوگا جو ان پر از روئے قانون عائد کی جائیں گی۔

اور از روئے قانون" ان حقوق کی جس طرح مٹی پلید کی جاتی ہے اس کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یونیسکو کے سوالنامہ کا جواب دیتے ہوئے شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر (QUINCY WRIGHT) نے کہا تھا کہ:۔

> تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر حال میں حقوقِ انسانیت کا احترام کرے گی۔ گذشتہ دنوں اقلیتوں پر جس قدر مظالم کئے گئے ہیں ان سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔

یہ اس لئے کہ دنیا کی ہر مملکت اپنے آپ کو اقتدارِ مطلق (ساورنٹی) کی مالک سمجھتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو پامال کر دے تو اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہوگا۔ ان کے برعکس، قرآنی مملکت پر مستقل اقدارِ خداوندی کا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ اپنے ہر فیصلہ اور عمل کے لئے قانونِ مکافات کی عدالت میں جوابدہ ہوتی ہے۔ فکرِ انسانی کا تجرباتی طریق ہنوز اس مقام تک نہیں پہنچا جس کی وجہ سے

---

[۱] ان تمام حقوق کے قرآنی حوالے میرے مجموعۂ مضامین "بہارِ نو" میں ملیں گے۔

بنیادی حقوق کے پیادے تو شائع ہو جاتے ہیں، ان پر عملدرآمد کہیں نہیں ہوتا۔

اس مقام پر عزیزانِ من! میں ایک اور اعتراض کی طرف آنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ عادت ہے کہ دنیا میں جہاں کوئی اچھا نظریہ سامنے آیا، انہوں نے کہہ دیا کہ اسلام میں یہ پہلے ہی سے موجود ہے۔ جب دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر صحیح نظریہ پہلے ہی سے اسلام کے اندر موجود ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اسلام سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے۔ اور ان کے اس قسم کے دعویٰ کا ان کے پاس ثبوت کیا ہوتا ہے۔ لیکن میں جو کچھ کہتا ہوں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں اور متعین اتھارٹی کی بنا پر کہتا ہوں۔ میری اتھارٹی قرآن کریم ہے جس کے متعلق ساری دنیا کو تسلیم ہے کہ وہ چودہ سو سال سے دنیا میں بغیر کسی تبدیلی کے موجود ہے۔ میں نے جو کچھ اس وقت کہا ہے (یا اس سے پہلے بھی جو کچھ کہتا چلا آرہا ہوں) ان میں سے ایک ایک دعویٰ کی تائید میں قرآن کی آیات موجود ہیں اور جب بھی کوئی طلب کرے انہیں پیش کرنے کے لئے تیار ہوں ؎

حقائقِ ابدی پر مدار ہے اس کا!
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

(۰)

مسلمان یونہی کہہ دیتے ہیں

غلط فہمی کی وجہ

جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "اسلام آگے نہیں چلا" جہاں تک میں نے غور کیا، ان کی غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ وہ (ہم) مسلمانوں کو اور اسلام کو مرادف سمجھ لیتے ہیں اور اسی وجہ سے انتہائی جسارت کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ اگر اسلام میں فی الواقعہ ایسی صلاحیت موجود ہے جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے تو پھر مسلمانوں کی حالت اس قدر پست کیوں ہے؟ اس اعتراض کا جواب میں شروع ہی میں دے چکا ہوں۔ اور وہ یہ کہ اسلام کے صدرِ اوّل میں مسلمان کچھ عرصہ تک اس اسلام پر کاربند رہے جو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا لیکن اس کے بعد انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور اپنی خود ساختہ روشوں پر کاربند ہو گئے۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ لہٰذا، موجودہ مسلمان اور اسلام ایک دوسرے کے مرادف نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بنابریں، مسلمانوں کی موجودہ حالت کو اسلام کے لئے بطور دلیل پیش کرنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ قیاس اور مفروضہ پر مبنی نہیں۔ ایک حقیقت کا بیان ہے۔ حقیقی اسلام کے بنیادی خط و خال سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ آپ انہیں پیشِ نظر رکھئے اور پھر دیکھئے کہ تمام عالمِ اسلام (یعنی مسلمانوں کے ممالک) میں کسی جگہ بھی اس اسلام کا نظام نافذ العمل ہے؟ آپ کو وہ نظام کہیں بھی رائج نظر نہیں آئے گا۔ ہر ملک میں غیر اسلامی نظام رائج نظر آئے گا۔ اس حقیقت سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت سے حقیقی اسلام کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ کرنا یا کوئی رائے قائم کرنا، صحیح نہیں۔ حقیقی اسلام کے متعلق، جو کچھ سابقہ صفحات میں کہا گیا ہے، آپ اس پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ اس میں نظامِ عالم بننے کی صلاحیت ہے یا نہیں! جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ہمارا

موجودہ اسلام، منزل من اللہ دین نہیں، بلکہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے، اور مذہب کوئی بھی ہو، اس میں زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ پروفیسر (HOCKING) کے الفاظ میں:۔

> یہ تمام مذاہب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادثِ زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ساحل پر پھینک دیا ہے) یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینانِ خویش نے (جو درحقیقت فریبِ نفس کا دوسرا نام ہے) ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر ہی نہیں آسکتی) ان کے عقائد و نظریات کے زنگ نے ان کے افکار و اعمال کے قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں سے اس قدر ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوجھ سے کام لینے کی جراُت کر سکیں۔
>
> (LIVING RELIGIONS AND A WORLD FAITH)

لہٰذا، جب تک اسلام کو مذاہب کی صف سے نکال کر، دین (ضابطۂ حیات) کی حیثیت سے نہیں سمجھا جائے گا، اس کے زندۂ جاوید ہونے کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکے گی۔ اسلام، مذہب کی جامد رسوم کا مجموعہ نہیں۔ وہ

اسلام ہی غالب رہے گا

زندگی کے غیر متبدل اصول و اقدار کا ضابطہ ہے۔ یہ غیر متبدل اصول قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں اور وہ برابر آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ خدا نے الحق پر مبنی دین (نظامِ حیات) اس لئے بھیجا ہے لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ۔ (۹/۳۳) تاکہ وہ انسانوں کے وضع کردہ ہر نظامِ حیات پر غالب آکر رہے۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کے پیشِ نظر گوئٹے نے (ECKER MANN) سے کہا تھا کہ:۔

> اسلام کی تعلیم کبھی ناکام ثابت نہیں ہوسکتی۔ ہم اپنے تمام نظام ہائے حیات کے باوجود اس سے آگے جا ہی نہیں سکتے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔
>
> (بحوالہ خطباتِ اقبالؒ)

میں نے اس مختصر سی نشست میں اسلامی نظام کے جس قدر اصول آپ کے سامنے پیش کئے ہیں، آپ سوچئے کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ رفتہ رفتہ وہی اصول، انسانوں کے خود ساختہ اصولوں کی جگہ لے رہے ہیں! چونکہ یہ اصول ابدی ہیں اس لئے یہ بھی نہیں کہ انہوں نے کسی خاص زمانے میں تو اپنے انسانیت ساز نتائج مرتب کئے ہوں اور اس کے بعد یہ درخت سوکھ گیا ہو۔ ان اصولوں کے متعلق کہا یہ ہے کہ: مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔ ان کی مثال اس پھل دار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا۔ (۱۴/۲۴) یہ شجرِ طیب ہر موسم میں پھل دیتا جائے گا۔ کبھی خشک نہیں ہوگا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند   بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

نہ ہی یہ اصول بہبودیت کی طرح کسی خاص نسل یا قوم کے اندر محدود و محصور رہنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ قرآن ذکرٌ للعالمین ہے۔ یعنی تمام اقوام عالم کے لئے ضابطہ حیات۔ اگر کوئی قوم انہیں اپنانے کے بعد چھوڑ دے، تو یہ اصول معطل ہو کر نہیں رہ جاتے انہیں جو قوم بھی اپنائے گی ان کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہوگی۔ اس نے خود مسلمانوں سے برملا کہہ دیا تھا کہ: وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اگر تم نے ان سے منہ موڑ لیا تو تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی۔ اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی تم سے بہتر ہوگی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است   سازِ قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر   آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی   از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جداست   احتیاجِ روم و شام او را کجاست
حق اگر از پیشِ ما بردارد ش   پیشِ قومے دیگرے بگذاردش

یاد رکھئے! دنیا کی کوئی قوم نہ خدا کی چہیتی اولاد ہے نہ سوتیلی۔ وہ رب العالمین ہے، تمام اقوام کا نشو و نما دینے والا۔ اس لئے جو قوم بھی اس کے عطا کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہوگی، ان کے نتائج سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ جو انہیں چھوڑ دیگی ذلیل و خوار ہو جائے گی۔ وذالك الدين القيم۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا   قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

—————(۰)—————

حرفِ آخر

جو کچھ میں نے آپ احباب کی خدمت میں پیش کیا ہے، آخر میں اسے چند ایک الفاظ میں دہرا دینا چاہتا ہوں کہ دنیا میں آپ کو جہاں جہاں انسانی صلاحیتوں کی نمود نظر آتی ہے یہ صدقہ ہے خدا کی اس رحمت کا جسے اس نے تمام اقوامِ عالم کے لئے عام کر دیا تھا۔ (وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ) دنیا، قرآنی اصولوں اور ان کی روشنی میں متشکل کردہ قرآنی نظام کے کئی ایک گوشوں کو اپنا چکی ہے۔ بعض گوشوں کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ آگے چل کر اپنائے گی۔ اس لئے کہ ان کے بغیر نہ انسانی صلاحیتیں اپنی نشو و ارتقا کی تکمیل تک پہنچ سکتی ہیں نہ حسنِ کائنات میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا، بزمِ ہستی میں جہاں روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہے وہ اسی آفتابِ عالمتاب کی ضیا باریوں کے تصدق ہے اور گلشنِ عالم میں جہاں کوئی پھول کھلتا دکھائی دیتا ہے وہ اسی جانِ بہاراں کی نکہت پاشیوں کا رہینِ منت ہے:-

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو   آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفٰے او را بہا ست   یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفٰے است

والسلام

—————(۰)—————

حج کا مقصد

(جب حج کا زمانہ قریب آتا ہے تو تقاضے موصول ہونے لگ جاتے ہیں کہ حج کے مقصد کے متعلق لکھا جائے۔ ہم اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں لیکن احباب کے مطالعہ کے پیش نظر ہم ذیل میں پرویز صاحب کی وہ تقریر درج کرتے ہیں جو انہوں نے نومبر ۱۹۴۷ء میں ریڈیو پاکستان سے نشر فرمائی تھی)۔

اس سرزمین پر جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے وہ ایک اہم سوال کے حل میں غلطاں و پیچاں نظر آرہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانوں نے باہمی مل جل کر رہنا ہے اور جب وہ مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس تصادم اور ٹکراؤ سے فساد کی چنگاریاں اٹھتی ہیں جو ان کے خرمن امن و سلامتی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہیں۔ وہ سوال جس نے انسان کو ہمیشہ مضطرب و بیقرار رکھا ہے یہ ہے کہ کونسی شکل پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن و سلامتی سے رہ سکیں۔ انسانیت کی تاریخ اسی سوال کے حل کی مسلسل داستان ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے اس باب میں کیا کیا سوچا اور تجربہ نے اسے کس طرح غلط ثابت کر دیا۔ قرآن نے انسان کی اس کوشش اور کوشش کے مآل کو ایک چھوٹی سی مثال میں اس طرح واضح کر دیا ہے کہ نگہ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے وجد و کیف سے جھوم اٹھتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا (۱۶/۹۲) تمہاری مثال اس بڑھیا کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور پھر خود اپنے ہی ہاتھوں سے) اسے بکھیر ڈالا۔ قرآن کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھئے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کر کے دیکھئے کہ عبرت و موعظت کی کتنی داستانیں ہیں جو اس کے اندر لپٹی ہوئی ہیں اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے حوادث ہیں جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کے انسان کی جدوجہد کی تاریخ پر غور کیجئے۔ وہ اپنے لئے ایک عظیم الشان نظام تمدن تعمیر کرتا ہے۔ اس فلک بوس عمارت کی تکمیل میں انسانیت کی تکمیل کا راز مضمر دیکھتا ہے۔ وہ ایک عرصہ تک اپنے تصورات کی دنیا میں مسحور رہتا ہے لیکن ابھی وہ عمارت تکمیل تک بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے کہ وہی انسان اس عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا دیتا ہے اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ حسین مرقع خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتا جس کی ٹھیکریاں اپنے مٹے ہوئے نقوش سے آنے والوں کو اپنی حدیث الم سے آگاہ کرنے کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔ بابل اور نینوا۔ مصر اور یونان۔ چین اور ایران کے کھنڈرات کو چشم عبرت سے دیکھئے اور سوچئے کہ انسانوں نے اتنی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو کس طرح بار بار خود اپنے ہی ہاتھوں سے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔

ادوار سابقہ کی طرح عصر حاضر کے انسان نے بھی اس سوال کے حل میں دماغ سوزی کی اور اس کی فکر و کاوش کا نتیجہ نیشنلزم (قومیت پرستی) کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا جس پر اقوام مغرب اور ان کی دیکھا دیکھی دیگر اقوام عالم کی موجودہ سیاست کی بنیاد ہے۔ یورپ نے اس نسخہ کیمیا کو اس قدر کامیاب قرار دیا کہ ان کے آئینہ فکر میں قومی محبت (PATRIOTISM) کو شرف انسانیت کی انتہا تصور کر لیا گیا ہے۔ لیکن جنگ اول نے بالعموم اور

اس کے بعد جنگِ دوم کے اسباب و علل اور نتائج و عواقب نے بالخصوص اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ جسے تریاق سمجھا جاتا تھا وہ انسانیت کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ چنانچہ دانایانِ مغرب اپنی اس سوچ کی اینٹ کو خود اپنے ہاتھوں سے بکھیرنے کی فکر میں ہیں۔ ڈاکٹر ہکسلے نے ۱۹۳۷ء میں کہا تھا۔

قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بہ حیثیتِ انسان کچھ نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے۔ انانیت اور تکبّر پیدا کرتی ہے۔ باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس بھی ٹھہراتی ہے۔

اب اس مسئلہ کا حل یہ سوچا جا رہا ہے کہ مختلف اقوام کے گروہوں کو ملا کر متحدہ حکومتیں قائم کی جائیں حتیٰ کہ تمام اقوامِ عالم کی ایک مشترکہ حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ اقوامِ یورپ کا ایک گروپ بنا لینے کی تجویز یا مجلس اقوامِ متحدہ اور ان کی حفاظتی کونسل کا قیام یا ورلڈ ملی کا (ONE WORLD) کا تصوّر اسی انتہا کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال اقوامِ مغرب کے موجودہ تصوّرِ حیات کے ماتحت عملی طور پر اس کا امکان ہو یا نہ ہو، نظری طور پر اب یہی سمجھا جانے لگا ہے کہ اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ تمام دنیا کو ایک برادری تصوّر کر کے ان کے تمدنی مسائل کی پیچیدگیوں کا حل سوچا جائے چنانچہ ڈاکٹر (GAULD) اپنی کتاب (MAN, NATURE, AND TIME) میں لکھتا ہے۔

اب جو چیز بالکل فطری نظر آتی ہے یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی ایک منظم برادری قائم کی جائے۔

یہ ہے وہ حل جس تک ذہنِ انسانی بیسویں صدی تک پہنچ سکا ہے لیکن آج سے چودہ سو سال پیشتر جبکہ دنیا کی یہ حالت تھی کہ ایک گاؤں کے رہنے والے دوسرے گاؤں کے باشندوں سے بھی مشکل واقف ہو سکتے تھے قرآن نے یہ بتایا کہ: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ (۲/۲۱۳) چونکہ تمام نوعِ انسانی کو ایک قوم بن کر رہنا ہے اس لئے اس مقصد کے پیشِ نظر کہ ان کے مفاد کے باہمی تصادم سے فساد کی چنگاریاں نہ ابھریں، خدا نے ایسی تعلیم بھیجی جس پر عمل پیرا ہونے سے فساد کا امکان نہ رہے۔ چنانچہ اس نے حضراتِ انبیائے کرامؑ کا تذکرہ کرنے کے بعد جو اس تعلیم کے حامل تھے، فرمایا کہ: إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ (۲۱/۹۲) تمہاری یہ اُمّت ایک اُمّتِ واحدہ ہے اور اس کی وجہِ جامعیت اس حقیقت پر ایمان کہ ان سب کا پروردگار ایک ہے۔ اس وحدتِ انسانی کی عملی شکل اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہ ہو، سب انسان خدا کے قانون کے محکوم رہیں۔ یہ تعلیم اپنی آخری شکل میں قرآن کریم کی رُو سے انسانوں تک پہنچی جس کا مقصود تمام نوعِ انسانی کو ایک برادری تصوّر کر کے جمعیتِ اقوام کے بجائے جمعیتِ آدم کی عملی شکل تشکیل کرنا ہے۔ اگرچہ اسلام کے تمام احکام اور فرائض اسی نقطہ کی طرف قدم اٹھاتے ہیں لیکن اس کی تکمیل حج کے اجتماع میں ہوتی ہے جو اسلامی نظام کا اہم رکن ہے۔

حج سے مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان بلا تفریقِ رنگ و نسل اور بلا امتیازِ وطن و زبان، جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ محکومیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے۔ اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیرِ قیادت مرکزِ وحدتِ انسانیت، یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو۔ پھر یہ تمام امرائے ملت

اپنے میں سے ایک امیرالامراء کا انتخاب کریں اور مختلف ممالک کے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایک ایسا پروگرام مرتب کریں جو آئندہ سال کیلئے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے اور جو امن و سلامتی، انسانیت کا ضامن اور فلاح و سعادتِ آدمیت کا کفیل ہو۔ انتخاب کردہ امام اپنے خطبۂ حج میں اس پروگرام کا اعلان کردے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان، مقامِ منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات و جزئیات پر غور کریں اور سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر اس کا عملی اثر اور ردِعمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں۔ اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی جس کیلئے "قربانی" تجویز کی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ نمائندگان اپنے اپنے ملکوں میں واپس آجائیں اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں کو چلائیں۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن کریم نے تمام نوعِ انسانی کو ایک امتِ واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کیلئے بتایا ہے۔ قرآن کریم نے حج کے اس مقصد اور غایت کو دو مقامات پر دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ آپ ان مختصر ٹکڑوں کی جامعیت پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند اور کوئی انداز بیان اس سے بلیغ بھی ہو سکتا ہے؟ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کے اجتماع سے مقصود یہ ہے کہ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲/۲۸) تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں ان کے لئے کس قدر فائدے ہیں۔ اور اس کی غایت؟ قِيَامًا لِّلنَّاسِ (۵/۹۷) یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

غور کیجئے! کیا دنیا میں کسی کانفرنس، کسی اسمبلی، کسی پارلیمنٹ، کسی اجتماع کا مقصد اس سے بلند ہو سکتا ہے کہ وہ اجتماع دنیا میں شرفِ انسانیت کے قیام کا باعث ہو۔ کسی خاص قوم، خاص جماعت، خاص ملک، خاص ملت کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے قیام کا باعث! یہ ہے حج کے اجتماع کا مقصد یعنی قِيَامًا لِّلنَّاسِ۔

کہا جا سکتا ہے کہ آج اقوامِ متحدہ کی مجلس (U.N.O) کے اجتماعات میں تمام دنیا کی قوموں کے نمائندے جمع ہوتے ہیں اور ان کے سامنے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ دنیا میں امن و سلامتی رہے۔ پھر یہ اجتماعات اپنے مقصد پیشِ نظر میں کیوں کامیاب نہیں ہوتے اور حج کے اجتماع میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر وہ اجتماع ایسے بلند اور درخشندہ مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے؟ حج کے اجتماع میں فی الواقعہ ایک خصوصیت ہے اور وہ خصوصیت ہے ایک بندۂ مومن کے اس عہد و پیمان کی جو وہ اپنے خدا سے باندھتا ہے اور جس کی تجدید حج کا نقطۂ آغاز ہے۔ ایک عبدِ مسلم اپنے خدا سے اقرار کرتا ہے کہ: اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶/۱۶۳) میری صلوٰۃ اور میرے مناسک۔ میرا جینا اور میرا مرنا۔ سب کچھ فقط اللہ کے لئے ہے کسی اور غرض کے لئے نہیں۔ یعنی اس مقصد کے حصول کیلئے جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ یہ ہے وہ اقرار جس کی تجدید اس اجتماعِ عظیم سے پہلے تمام نمائندگان فدا کارانہ انداز سے خدا کے گھر یعنی ملتِ حنیفہ کے مرکزِ محسوس کے گرد گھوم کر کرتے ہیں اور اس طرح زمین و آسمان کو اپنے اس عہد پر گواہ ٹھیراتے ہیں۔ اس نصب العین کو دل میں لئے ہوئے، یہ نمائندگانِ نوعِ انسانی، انسانیت کی فلاح و سعادت کا پروگرام مرتب کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا عہد باندھتے ہیں۔ یہ ہے وہ خصوصیت جو دنیا میں کسی اور اجتماع کو حاصل نہیں۔ لہٰذا وہ اجتماعات، بلند آہنگ دعووں کے باوجود انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے نہ آج تک کچھ کر سکے ہیں نہ آئندہ کر سکیں گے۔ پہلی جنگ کے بعد، اقوامِ مغرب نے جمعیۃ الاقوام (LEAGUE OF NATIONS) کی طرح ڈالی۔ لیکن علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "کفن چوروں" کی یہ جماعت جس بُری طرح ناکام ہوئی، واقعات اس پر شاہد ہیں۔ اسکے متعلق (Mr. REEVES) اپنی کتاب (ANATOMY OF PEACE) میں لکھتا ہے کہ "لیگ آف نیشنز" کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم کی گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ دنیا کے مختلف قوموں کے نمائندوں کو یکجا کر کے باہمی بحث و تمحیص

سے دنیا کا امن قائم رکھا جا سکتا ہے"۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اقوامِ مغرب نے پھر اپنے ناکام تجربے کو دہرایا اور سمجھ لیا کہ لیگ آف نیشنز کا نام (UNITED NATIONS ORGANISATION) رکھ دینے سے کامیابی ہو جائے گی۔ یہ جمعیتِ اقوامِ متحدہ کس بُری طرح ناکام ثابت ہو رہی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ابھی دو ہفتے ہوئے لندن کے اخبار "ڈیلی میل" نے لکھا ہے کہ "جمعیتِ اقوامِ متحدہ اپنی موجودہ ہیئت میں امنِ عالم کے لئے سخت خطرے کا موجب ہے اس لئے اسے فوراً ختم کر دینا چاہیئے۔" اور اس کی وجہ (MR. REEVES) کے الفاظ میں یہ ہے کہ "ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم نے انسانی معاشرہ میں جو خلفشار پیدا کر رکھا ہے اسے کس طرح دور کیا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان نیشنلزم یا انٹرنیشنلزم کے ذریعہ دور نہیں ہو سکتا جس چیز کی ضرورت ہے وہ نوعِ انسانی کی برادری ہے نہ کہ بین الاقوامیت۔" یعنی وہی چیز جسے علامہ اقبالؒ نے آج سے بہت پہلے ان الفاظ میں کہا تھا کہ :-

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام | پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود | اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم
مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام | جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

حج سے مقصود اسی "جمعیتِ آدم" کی تشکیل تھا۔ اس حج پر نگاہ رکھیئے اور پھر اُس حج پر جو آج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس آئین کہن میں آج بھی وہی روح پیدا کی جا سکتی ہے جو انسانیت کے شرف کی کفیل ہے۔ آج عالمِ اسلامی چاروں طرف سے مصائب و نوازل سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کے نقشے پر کہیں ان کا نام نہ رہنے پائے۔ مسلم اقوام کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں کہ باہمی اتحاد سے ان مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور روابط کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ باہمی میل ملاپ کے سلیقے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن کسی کی نگاہ اس طریقِ ربط و اخوّت کی طرف نہیں اٹھتی جسے ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا تھا جس سے ہمارے دلوں میں ائتلاف اور نگاہوں میں یک رنگی پیدا ہو جاتی تھی۔ ہم اسے ایک بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں اور اس میں روح پھونکنے کی کوئی تجویز نہیں سوچتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم دیگر اقوامِ عالم کی تقلید میں کانفرنسیں طلب کرتے رہیں گے۔ ہماری کامیابیاں انہی کے پیمانوں سے ناپی جائیں گی۔ لیکن جس وقت ہم نے اپنے اللہ سے کھلایا ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اس مرکز کو زندہ کر دیا جس کی زندگی سے تمام نوعِ انسانی کی زندگی وابستہ ہے، اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصّہ میں آ جائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے ممبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشتِ حیات سرسبز و شاداب ہو گی۔

آج مسلمانانِ عالم کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ :-

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے | نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

والسلام

—— (٠) ——

(وہ دن بھی کیا تھے جب ہمارے ریڈیو سے اس قسم کی تقریریں نشر ہوا کرتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہنوز ہمارے ذرائع ابلاغ کی سرسبز و شاداب شاخوں کو نہ مفاد پرستیوں کی اکاس بیل نے مرجھا دیا تھا اور نہ ہی انہیں قدامت پرستی کے ٹڈی دل نے چاٹا تھا۔ کیا وہ دن پھر کبھی نہیں آئیں گے؟)

—— (٠) ——